ماہنامہ مجلّہ

حیاتِ نو

بلریا گنج

عقیدہ تقدیر

بلکہ تمام عقائد کے سلسلے میں
سلامتی کا راستہ یہ ہے کہ ہم اصلی اور بنیادی
ماخذ کی طرف رجوع کریں۔ اور وہ قرآن
حکیم ہے اور سلف صالحین یعنی صحابہ کرام
اور تابعین عظام رضوان اللہ علیہم
اجمعین کا اتباع کریں۔
(شیخ علی طنطاوی)

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

بلریا گنج

جلد نمبر ۱۶	محرم۔ صفر۔ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ مئی۔ جون ۲۰۰۰م	شمارہ ۵۔۶
مدیر مسئول نور محمد فلاحی	**مدیر** عبد البر اثری فلاحی	**مدیر معاون** انیس احمد فلاحی

☆ سالانہ زر تعاون : ۵۰ روپئے
☆ خصوصی زر تعاون : ۱۰۰ روپئے
☆ بیرون ملک : ۲۵؍ امریکی ڈالر

☆ طلبہ کے لیے : ۴۰ روپئے
☆ اعزازی زر تعاون : ۱۰۰۰ روپئے
☆ قیمت فی شمارہ : ۸ روپئے

اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے لہذا جلد از جلد سالانہ زر تعاون ارسال فرمائیں۔

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ مجلہ حیات نو، جامعۃ الفلاح
بلریا گنج، اعظم گڑھ (یوپی) ۲۷۶۱۲۱
☆فون نمبر 05466-25115

نقوش حیات نو

ادار یہ

لب ہر غنچہ پر نوحہ ہے اس کا	انیس احمد فلاحی	۳

درس حدیث

اخلاص اور استحضار نیت	ولی اللہ مجید قاسمی	۵

سیر و سوانح

مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ	محمد عارف عمری	۸
مولانا نور محمد فلاحیؒ ایک نظر میں	آفتاب عالم فلاحی	۱۴
مولانا نور محمد صاحب کا بچپن	قمر رسول پوری	۱۶
مولانا کے اوصاف حسنہ	محمد طاہر مدنی	۱۷

بحث و نظر

عالم اسلام پر فکری یلغار. غور و فکر کے بعض پہلو	عطر یف شہباز ندوی	۱۹
ملکی سیاست اور ہندوستانی مسلمان	عبد العزیز سلفی فلاحی	۲۹

مذاہب عالم

جین مت	انیس احمد فلاحی	۴۷

فقہ و فتاوی

مسئلہ رضاعت وحضانت	ادارہ	۵۰
طلاق کے بعد بیویوں کو دیئے گئے زیورات کی ملکیت کا مسئلہ		

تعارف و تبصرہ

سفر حج مغفرت کی منزل کا زینہ	سلیم انصاری	۵۲

شعر و نغمہ

ترانہ فلاح	مولانا شبیر احمد انور اصلاحی	۵۴
درس عبرت	عبد الرؤف صابر رحیمی	۶۳

روداد انجمن

قطر یونٹ کی تعزیتی نشست	محمد اکرم فلاحی	۵۶
جامعہ ملیہ میں فلاحی طلبہ کی تعزیتی نشست		۵۹

جامعہ کے لیل و نہار

کمپیوٹر سنٹر کا قیام		۶۰
تعزیتی نشست		
فلاحی برادران کو صدمہ		
مولانا صدر الدین اصلاحیؒ نمبر منظر عام پر		

حلقہ یاراں

سید عبد الرحیم فلاحی		۶۴

ادار یہ

لب ہر غنچہ پر نوحہ ہے اس کا

انیس احمد

جامعہ کے مخلص اور بے لوث خادم جناب مولانا نور محمد صاحب فلاحی کے انتقال کی خبر سنتے ہی جامعہ میں ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ تعطیل کا اعلان کر دیا گیا اور جملہ اساتذہ و کارکنان اور طلبہ بسوں کے ذریعہ مولانا کے وطن رسول پور پہنچے اور آپ کی نماز جنازہ میں شرکت فرمائی۔ آپ کی نماز جنازہ صدر جامعہ مولانا طاہر صاحب مدنی نے پڑھائی اور وہیں آپ کے آبائی قبرستان میں آپ کو سپرد خاک کر دیا گیا استاد محترم مولانا نور محمد صاحب فلاحی جامعۃ الفلاح کے ان فارغین میں سے ایک تھے جن کی مخلصانہ کوششوں نے جامعہ کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا اور جن کی نیک نامی نے جامعہ کو نیک نام بنایا اور خدا ترسی نے تقوی و خدا ترسی کی لہر چلائی۔ فراغت کے بعد کچھ دنوں تک آپ نے چھندوارہ حیدر آباد اور مدرسۃ النجاح رسول پور میں تدریسی فرائض انجام دیئے اور پھر جامعہ سے منسلک ہو گئے۔

آپ کا طرز تدریس استخراجی تھا انداز بیان دلنشین اور زبان انتہائی سلیس تھی۔ اور سب سے اہم خوبی طلبہ کے تئیں وہ مشفقانہ و پدرانہ جذبات تھے جس سے طلبہ آپ سے بہت جلد مانوس ہو جاتے اور آپ کے ارشادات کی تعمیل میں جان چھڑکتے مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ آپ اپنے طلبہ کو وہ پیار دیتے جو بہتوں کو اپنے گھر میں بھی نصیب نہ ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ ابنائے قدیم جامعہ آتے ہی آپ سے ملاقات کی شدید خواہش کا اظہار کرتے۔

مولانا مرحوم کا ہر طالب علم سے لگاؤ اور قلبی تعلق تھا اور آپ کے ہر لگاؤ کی بنیاد اخلاص پر قائم تھی اس لیے وہ لگاؤ والوں سے ملاقات کرنے ان کے گھر ضرور جاتے۔ وہ ہمارے گھر اکثر و بیشتر آتے اور دیر تک بیٹھ کر میری والدہ (جن کی عمر اسی سال ہے) سے باتیں کرتے رہتے۔ میں جب عربی درجات میں پہونچا تو مولانا میری والدہ کو میری تعلیمی دلچسپی کی روداد سناتے۔ میری والدہ ان سے کہتیں

کہ میرے بیٹے کو مدینہ بھیج دیجئے۔ مولانا پورے وثوق سے کہتے کہ ان شاء اللہ ضرور جائیں گے۔ یہ کہتے وقت مولانا کے چہرے پر اخلاص کا ایسا نور چمکتا ہوا محسوس ہوتا تھا کہ اس کی روشنی میں مجھے بھی دیار نبوی میں اپنے طالب علم ہونے کی سعادتمندی کا احساس ہونے لگتا اور آخر کار اس اخلاص آرزو نے مجھے اس سعادت سے بہرہ مند بھی کردیا۔ اس واقعہ سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مولانا کو اپنے طالب علموں کی علمی وروحانی ترقی کی کتنی فکر رہتی تھی۔

موصوف بڑے ہی ملنسار اور کریمانہ اخلاق کے حامل تھے۔ اپنی زبان وبیان سے کسی کو اذیت نہ پہنچاتے اور اگر یہ کہا جائے کہ آپ "المسلم من سلم المسلمون من لسانه و يده" کے مکمل مصداق تھے تو بے جانہ ہوگا۔ جامعہ کی تعمیر وترقی کے لیے آپ کی لگن قابل دید تھی۔ اس کی ہمہ جہتی ترقی اور اسکے فنڈ کی فراہمی میں آپ کے رول کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جامعہ کی تاریخ جب بھی مرتب کی جائے گی تو اس کے جاں نثاروں اور پروانوں میں آپ کا تذکرہ ضرور شامل رہے گا۔ ان شاء اللہ۔ جامعہ کے تئیں آپ کے اخلاص کی ایک روشن دلیل انجمن طلبہ قدیم کے پلیٹ فارم سے اس کی تعمیر و ترقی کے لیے ہر ممکن کوشش بھی ہے۔ مرحوم برابر اس پلیٹ فارم سے جامعہ کو علمی ترقی کے بام عروج تک پہنچانے کے لیے کوشاں رہے۔

مولانا کا رنگ گندمی تھا۔ بھرا ہوا جسم اور میانہ قد تھا۔ بات ٹھہر ٹھہر کر کرتے جیسے فکر کی میزان میں ہر بات کو تول تول کر لب اظہار تک لاتے ہوں۔ غذا اور لباس میں سادگی نمایاں تھی۔ کالر والی قمیص اور بغیر کالر والا کرتا اور تنگ موری پائجامہ اور کپڑے کی ٹوپی عام لباس تھا۔ کبھی کبھی اون والی رامپوری ٹوپی کا بھی استعمال کرتے۔ سردیوں میں زیادہ تر گرم چادر اوڑھے رہتے۔ موسم کے لحاظ سے شیروانی بھی استعمال کرتے تھے۔ خط انتہائی نفیس اور عمدہ تھا۔ مولانا کو تصنیف وتالیف سے بھی دلچسپی تھی۔ تاعمر حیات نو کے مدیر مسئول رہے اور اسے ظاہری اور معنوی ہر اعتبار سے خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش میں لگے رہے۔ جامعہ کے لیل ونہار کا کالم ایک عرصہ تک آپ کے ہی قلم کا مرہون منت رہا۔ آغاز شباب ہی سے جماعت اسلامی سے منسلک ہو گئے اور تاعمر استقامت کے جوہر دکھاتے رہے۔ رسول پور کی مقامی جماعت کی تشکیل اور اس کے ارتقاء میں آپ کا اہم رول تھا۔

اللہ رب العزت مرحوم کی مغفرت فرمائے اور آپ کی بشری لغزشوں سے درگذر فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین! ☆

درس حدیث

اخلاص اور استحضار نیت

ولی اللہ مجید قاسمی صاحب
استاذ حدیث وفقہ جامعۃ الفلاح

عن امیرالمؤمنین عمر بن الخطاب قال سمعت رسول الله ﷺ يقول انما الاعمال بالنيات وانما لكل امريء ما نوى فمن كانت بجرته الى الله و رسوله فهجرته الى الله ورسوله ومن كانت هجرته لدنيا يصيبها أو إلى إمرأة ينكحها فهجرته الى ما هاجر اليه ۔ (صحیح بخاری و مسلم)

امیر المومنین حضرت عمرؓ بن الخطاب سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ آپ فرمارہے تھے کہ عمل کا اعتبار نیت سے ہوتا ہے اور ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہے، لہذا جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہے تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول ہی کے لیے ہوگی (پھر وہ مقبول کیوں نہ ہو وہ تو مقبول ہی ہے) اور جس نے دنیا کمانے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کی خاطر ہجرت کی ہوگی تو اس کی ہجرت اسی کام کے لیے ہوگی۔

حدیث کی اہمیت

مشہور محدث ابن بطال کا خیال ہے کہ ہجرت مدینہ کے بعد سب سے پہلا اعلان جو بارگاہ نبوت سے اشاعت پذیر ہوا یہی تھا، اور امام شافعی، احمد ابن حنبل اور دوسرے بہت سے فقہا اور محدثین کا خیال ہے کہ اس حدیث پر اسلام کے ایک تہائی حصہ کا دارومدار ہے کیوں کہ عمل کا تعلق دل سے ہوتا ہے یا زبان سے یا دگر اعضاء سے اور نیت دل کا فعل ہے لہذا وہ ان تینوں کی قسموں میں سے ایک ہے بلکہ ان میں سب سے اعلی اور افضل ہے کیوں کہ یہ ایک مستقل عبادت ہے اور دیگر قسمیں عبادت بننے میں اس کی محتاج ہیں، امام بخاری کہتے ہیں کہ پورے ذخیرہ ٔ حدیث میں اس سے جامع اور کثیر الفوائد کوئی دوسری روایت موجود نہیں ہے اور امام ابو داؤد کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی پانچ لاکھ حدیثیں لکھی ہیں اور ان میں سے چار ہزار آٹھ سو حدیثوں کا انتخاب کیا ہے، اور ان میں چار حدیثیں ایسی

ہیں جو کسی کو دینی زندگی گذارنے کے لیے کافی ہیں، ان چار حدیثوں میں ایک حدیث یہ بھی ہے۔

تشریح

نیت کسی کام کے قصد وارادہ کو کہتے ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ قصد میں میں صرف ارادہ ہوتا ہے اور نیت میں ارادہ کسی غایت پر پہنچنے کا ہوتا ہے، نیز نیت میں تمیز بھی مقصود ہوتی ہے اور تمیز کبھی ایک عمل کی دوسرے عمل سے ہوتی ہے جیسے کہا جائے کہ ظہر کی نیت کرو تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ عصر کی نیت نہ ہو، اور کبھی عادت وعبادت میں فرق کرنا مقصود ہوتا ہے جیسے بغیر کسی نیت کے ہفتہ میں کسی دن بھوکا پیاسا رہے تو اسے روزہ نہیں کہا جائے گا اور نہ ہی عبادت ہوگی بلکہ ایک عادت شمار ہوگی البتہ نیت کرلی تو یہ عمل عبادت بن گیا، اور نیت دو طرح کی ہوتی ہے۔ صحیح اور فاسد، اور کسی عمل کا نتیجہ وثمرہ اسی نیت پر مرتب ہوتا ہے جیسی نیت ہوگی ویسا ہی نتیجہ ہوگا، عمل خواہ بڑا ہو یا چھوٹا اسے اچھی نیت سے کیا جائے تو اس میں برکت بھی ہوگی اور روحانی ترقی ونمو کے آثار بھی نمایاں ہوں گے۔ اور اگر نیت خراب ہے تو عمل بھی مذموم ہوگا گرچہ وہ بظاہر اچھا کام کیوں نہ ہو، حدیث میں اسی کو مثال کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے کہ ہجرت کس قدر عظیم قربانی ہے کہ انسان محض اپنے عقیدہ وایمان کی خاطر گھر بار، مانوس معاشرہ اور خاندان سے رخ موڑ لیتا ہے اور ایک اجنبی جگہ جاکر پناہ لیتا ہے لیکن اس قربانی کی اہمیت اور قدر وقیمت اسی وقت ہوگی جبکہ ہجرت کا مقصد اللہ کی رضاجوئی اور دین وایمان کی حفاظت ہو۔ لیکن بظاہر دین وعقیدہ کی حفاظت کے لیے ترک وطن کر رہا اور اس کی آڑ میں دنیا کا حصول مقصود ہو تو ایسی ہجرت اس کے منہ پر ماردی جائے گی۔

ایسے ہی اللہ کی راہ میں جہاد کس قدر قابل اجر وثواب ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے لیکن وہ اجر وثواب کا حقدار اسی وقت ہوگا جبکہ نفسانی جذبہ، وطنی اور قومی عصبیت سے اوپر اٹھ کر محض اللہ کی رضاجوئی کے لیے جنگ کرے، لوگوں سے قتال اس لیے کرے تاکہ اللہ کا کلمہ بلند ہو، چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ: سئل رسول الله ﷺ عن الرجل يقاتل شجاعة و يقاتل حمية ويقاتل رياء اى ذلك فى سبيل الله، فقال رسول الله ﷺ من قاتل لتكون كلمة الله هى العليا فهو فى سبيل الله.

اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کوئی شخص بہادری جتلانے کے لیے لڑتا ہے اور کوئی قومی حمیت کے لیے جنگ کرتا ہے، اور کوئی ریاو شہرت کی خطر قتل وقتال کرتا ہے ان مین اللہ کی راہ میں لڑنا کسے کہا جائے گا اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے لڑے اسی کو اللہ کی راہ میں لڑنے والا کہا جائے گا۔ (صحیح بخاری ومسلم)

مسجد کی تعمیر کس قدر عظیم الشان کام ہے وہ محتاج اظہار نہیں ہے، مگر آنحضور ﷺ کے عہد مسعود میں مدینہ کے اندر ایک مسجد تعمیر کی جاتی ہے تو آسمان سے جبرئیل امین وحی لیکر آجاتے ہیں کہ اس مسجد کو زمین بوس کر دیا جائے، کیوں کہ اس مسجد کی تعمیر کا مقصد اللہ واحد کی عبادت وبندگی، عظمت وکبریائی کا اعلان واظہار نہیں تھا، وہ مسجد مسلمانوں کے درمیان اتحاد واتفاق کی علامت نہ تھی بلکہ اس کی تعمیر کا مقصد مسلمانوں کو نقصان پہونچانا اور اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کرنا تھا۔ وہ مسجد اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کرنے والوں کو شہ دینے کے ارادے سے بنائی گئی تھی۔

غرضیکہ اعمال خیر ترقی کا ذریعہ ہیں وہی انسانیت کو حیوانیت کے دائرے سے نکال کر فرشتوں کی صف میں جگہ دلاتے ہیں، نیز عمل میں صورت عمل بھی مطلوب ہے مگر اصل چیز وہ قلبی کیفیت ہے جسے نیت کہتے ہیں اور عمل کے مقبول ومردود ہونے کا مدار اسی پر ہے۔ صورت عمل خواہ کتنی ہی اعلی اور بہتر کیوں نہ ہو لیکن نیت خراب ہو تو اللہ کے نزدیک اس کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہے۔ اور ایک معمولی کام اخلاص اور اچھی نیت سے کیا جائے تو وہ اللہ کی نگاہ میں بڑے قدر ومنزلت کا حامل ہوتا ہے، کیوں کہ یہاں عمل کی مقدار اور سائز کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ اصل قیمت اخلاص اور نیت صالح کی ہے جس قدر اخلاص اور جیسی نیت ہوگی اسی کے مطابق ثمرہ ملے گا، چنانچہ شیخ داؤد کبیر فرماتے ہیں" على قدر ارتقاء بمتك فى نيتك يكون ارتقاء درجتك عند عالم سريرتك" دلوں کے رازداں کے یہاں تمہارے درجات کی ترقی، تمہاری نیت کی ترقی کے مطابق ہوگی۔ اور مومن کا ہر جائز عمل باعث اجر وثواب ہے اگر اسے شعوری طور پر استحضار نیت کے ساتھ انجام دے بشرطیکہ نیت اچھی اور خالص ہو بلکہ وہ عمل بھی کار ثواب ہے جسے بطور عادت، ضرورت اور نفس کی شہوت کی تسکین کے لیے انجام دیا جاتا ہے، اور جس کے باعث ثواب ہونے کی طرف عام طور پر ذہن نہیں جاتا ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ: وانك لن تنفق نفقة تبتغى بها وجه الله الا أجرت عليها حتى ما تجعل فى فى إمرأتك. (اللہ کی رضاجوئی کے لیے تم جو بھی خرچ کرو اس پر تمہیں اجر دیا جائے گا یہاں تک کہ بیوی کے منہ میں لقمہ ڈال دینا بھی کار ثواب ہے)۔ (صحیح بخاری ومسلم) اور ہر عمل باعث عقاب اور اللہ کی رحمت سے محرومی کا سبب ہے اگر اسے غلط نیت کے ساتھ انجام دیا جائے گرچہ بظاہر عمل خیر اور عبادت ہی کیوں نہ ہو۔ ☆

مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ (۳)

مولانا محمد عارف عمری

رفیق دارالمصنفین اعظم گڑھ (یوپی)

علمی خدمات

مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ مدۃ العمر علم و تعلیم سے وابستہ رہے، مختلف مدارس عربیہ میں انکی تدریسی خدمات کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس کے علاوہ وہ اپنے گاؤں میں مقیم رہے اس دوران بھی انھوں نے گاؤں کے طلبہ کو پڑھانے کا سلسلہ بر قرار رکھا، اوران کا طریقہ ء تدریس بہت دلچسپ انداز کا ہوا کرتا تھا، وہ اپنے کھیت پر جاتے اور وہیں طلبہ کو بھی بلا لیتے تھے اور کھیتی باڑی کے کاموں کی مشغولیت کے ساتھ طلبہ کو پڑھاتے بھی رہتے۔

ان کے گاؤں میں ابتداءاً کوئی باقاعدہ مکتب نہیں تھا مولانا شبلی متکلم ندوی کی تحریک پر ۱۹۴۵ء میں ایک مکتب کی بنیاد ڈالی گئی اور کچھ دنوں طلبہ مختلف لوگوں کے بیٹھک میں قرآن مجید اور دینیات کی تعلیم حاصل کرتے رہے، ۱۹۵۲ء میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ اپنے والد کی وفات کے بعد گاؤں تشریف لائے تو اسی موقع پر مکتب کی ایک عمارت کی بنیاد ان سے رکھوائی گئی جس کا نام مدرسۃ الاسلام رکھا گیا، مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ اول روز سے اس مکتب سے وابستہ رہے اور اس کی بناو تاسیس میں انھوں نے اوران کے یار غار مولانا محمد انیس اصلاحی مرحوم نے نمایاں حصہ لیا۔

مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ کے تلامذہ کی تعداد بے شمار ہے، تاہم بعض طلبہ سے ان کو خاص انس اور محبت تھی اوران کا ذکر وہ وقتاً فوقتاً کیا کرتے تھے ان طلبہ میں سب سے زیادہ ذکر مولانا عصمت کا کرتے تھے، جو مدرسۃ الاصلاح میں ان کے شاگرد رہ چکے تھے اور پڑگہ صوبہ مہاراشٹر کے رہنے والے تھے، اور انھیں کی دعوت پر مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ ایک زمانہ میں کچھ دنوں کے لیے پڑگہ بھی بغرض تدریس تشریف لے گئے تھے، ان کی نوک زبان پر دوسرا نام مولانا قمر الدین صاحب بڑھل گنجی کا ہوا کرتا تھا، جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور کے ان کے شاگرد تھے، مولانا ان کی یہ جفاکشی، محنت اور طلب علم کے ذوق و شوق کا ذکر کرتے، اس دور میں بڑھل گنج سے مبارکپور کا سفر بڑا صبر آزما اور مرحلہ وار ہوتا تھا

، دریائے گھاگھرا اور ٹونس دونوں پر پل تعمیر نہیں ہوئے تھے، مگر وہ طلب علم کی خاطر یہ پر مشقت سفر کرتے تھے، چند برس قبل مدرسہ بیت العلوم سرائے میر میں ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، راقم کے والد ماجد مولانا مستقیم احسن اعظمی مد ظلہ نے ان کے استاد کا ذکر کیا تو حد درجہ شفقت و محبت کے ساتھ پیش آئے، آج کل وہ دارالعلوم دیوبند کے درجات عالیہ کے استاد اور مہتمم تعلیمات ہیں۔

مولانا داؤد اکبر اصلاحی کی زبان سے کبھی کبھی میں یہ سنا کرتا تھا کہ ایک زمانے مین دارالعلوم دیوبند سے کچھ لڑکوں کا اخراج ہوا، یہ لڑکے اسٹرائک کے جرم میں وہاں سے نکالے گئے تھے، ان میں سے تین لڑکوں کے متعلق دارالعلوم دیوبند کے دفتر اہتمام نے جملہ مدارس عربیہ کو اس مضمون کا خط روانہ کیا کہ یہ لڑکے شر پسند اور مفسد ہیں اس لیے ان کو اپنے مدرسہ مین داخل نہ کریں، اتفاق سے ان تینوں میں سے دو لڑکے مدرسۃ الاصلاح پہنچے اور مدرسہ نے دارالعلوم دیوبند کی ہدایت کو نظرانداز کر کے ان کو اپنے یہاں داخل کر لیا، وہ ان دونوں لڑکوں کی ذہانت اور علمی لیاقت کی بڑی تعریف کرتے تھے، مگر وہ لڑکے کچھ ہی دنوں بعد مدرسہ الاصلاح سے چلے گئے، اس وقت تو یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ دونوں طالب علم کون تھے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ ان مین ایک مولوی محمد طاہر گیاوی تھے جو اس وقت ایک مناظر اور خطیب کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں اور دوسرے ہمارے مخلص کرم فرما اور فاضل دوست مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی تھے جو اس وقت مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور کے صدر مدرس ہیں۔

اس ضمن میں شاید اس بات کا ذکر بیجا نہ ہو کہ مدرسۃ الاصلاح نے ان طلبہ کو اپنے یہاں جگہ دیکر بلند ظرفی کی ایک مثال قائم کی ہے، مگر ۱۹۷۰ء میں خود مدرسہ نے اپنے تین طالب علموں کے ساتھ یہی سلوک کر کے دارالعلوم دیوبند کے نقش قدم کی پیروی کی۔ چنانچہ ان لڑکوں کو بعض مدارس سے ناکام و نامراد واپس لوٹنا پڑا اور ان میں صرف ایک مولوی محمد طیب صاحب، ایک معروف اور نو قائم شدہ درسگاہ مولانا آزاد تعلیمی مرکز اسرہٹہ جونپور سے فارغ التحصیل ہو سکے، بقیہ دو تکمیل تعلیم سے محروم رہے۔

مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ کی جامعۃ الفلاح سے وابستگی بالکل اخیر عمر میں ہوئی تھی اور اس درسگاہ میں ان کو بہت کم وقت بسر کرنے کا موقع مل سکا، تاہم وہ یہاں کے اساتذہ اور طلبہ سے بہت مطمئن و مسرور تھے، بالخصوص کلیۃ البنات کی طالبات کے شوق علم کے بڑے مداح تھے۔ ایک دفعہ رمضان

المبارک کی تعطیل میں میرا گھر آنا ہوا تو دیکھا کہ وہ کلیۃ البنات کے آخری درجہ کے مضمون قرآن مجید کی کاپیاں جانچ رہے ہیں۔ اس وقت انھوں نے طالبات کے شوق علم کی تعریف کرتے ہوئے تحیر آمیز مسرت کے ساتھ مجھ کو دو کاپیاں دکھلائیں، ان کی عام عادت یہ تھی کہ وہ نمبرات بہت کم دیتے تھے، مگر ان کاپیوں پر انھوں نے خلاف معمول زیادہ نمبر دیے تھے۔

تعلیم و تدریس کے ساتھ ان کے اندر لکھنے پڑھنے کا ذوق بھی شروع ہی سے تھا، ان کی مضمون نگاری کا آغاز "الاصلاح" اور "ترجمان القرآن" جیسے موقر رسالوں سے ہوا، الاصلاح میں ان کے متعدد مضامین شائع ہوئے جو فکر فراہی کے آئینہ دار اور طبع زاد ہیں، اس کے بعض مضامین علامہ حمید الدین فراہی کی الامعان فی اقسام القرآن کو مد نظر رکھ کر لکھے گئے ہیں اور بعض قرآن مجید کی مطلوبہ صفات ایمان، تقوی و خلوص کی تفصیل و تشریح پر مشتمل ہیں۔

مولانا داؤد اکبر اصلاحی کے الاصلاح کے مضامین کو ادارہ علوم القرآن علی گڑھ نے اپنے مجموعہ ء مضامین میں "قرآنی مقالات" مطبوعہ ۱۹۹۱ء میں یکجا کر دیا ہے۔ ادارہ کے فاضل ارکان نے اس مجموعہ کے تمام مقالوں کو حواشی اور مراجع کی صراحت کے ساتھ شائع کر کے ایک اہم علمی خدمت انجام دی ہے۔ اس میں مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ کے درج ذیل مضامین شامل ہیں۔

۱۔ والنجم اذا ھویٰ (الاصلاح فروری ۱۹۳۹ء) ۲۔ لااقسم بھذا البلد (مئی ۳۶ء)
۳۔ والعادیات ضبحاً (مارچ اپریل ۳۹ء) ۴۔ مومن قرآن کے آئینہ میں (اگست ۳۹ء)
۵۔ تقوی (فروری و مارچ ۱۹۳۷ء) ۶۔ خلوص (اکتوبر ۳۷ء)

اس کے علاوہ ان کے متعدد مضامین ترجمان القرآن (حیدر آباد) معارف (اعظم گڑھ) برہان (دہلی) ندیم (گیا) اور صدق و فاران میں بھی شائع ہوئے، راقم الحروف کی معلومات کی حد تک ان کی تفصیل حسب ذیل ہے :۔

۱۔ تفسیر آیت 'ما کان لنبی ان یکون لہ اسری' (ترجمان القرآن ج ۹ عدد ۴ ماہ شوال ۱۳۵۵ھ / دسمبر ۱۹۳۶ء و جلد ۱۰ عدد ۶ و جلد ۱۱ عدد ۱ ماہ جمادی الاخری و رجب ۱۳۵۶ھ / اگست، ستمبر ۱۹۳۷ء) اس مضمون میں انھوں نے جمہور مفسرین کے بر خلاف ایک نئی رائے پیش کی ہے۔ ترجمان القرآن کے مدیر مولانا سید ابو الاعلی مودودیؒ نے جمہور کے موقف کی تائید کرتے ہوئے اس کے حاشیہ

میں اور الگ سے بھی ایک فٹ نوٹ لکھا اور اسی سلسلہ کا مولانا مودودیؒ کا ایک خط بنام مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ مجلہ حیات نو نے مولانا داؤد اکبر کے انتقال کے بعد ماہ اگست ۸۳ء کے شمارہ میں شائع کیا ہے، جس کے اخیر میں مولانا مودودیؒ نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ "اس مسئلہ میں اگر آپ دوبارہ کچھ تحریر فرمائیں گے تو خوشی کے ساتھ شائع کیا جائے گا اور اس پر اگر ضرورت ہوئی تو میں بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ کچھ عرض کر سکوں گا۔" (حیات نو شمارہ اگست ۸۳ء ص ۲۹)

۲۔ اقسام قرآن (ترجمان القرآن ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ / فروری ۱۹۳۷ء / ج ۹ عدد ۶) اس مضمون میں قسم کے موضوع پر مشتمل سورہ بروج کی ابتدائی آیات کی تفسیر و توجیہ مولانا فراہیؒ کے نقطہ ء نظر سے کی گئی ہے۔

۳۔ شکر (ترجمان القرآن ماہ رمضان المبارک ۱۳۵۶ھ / نومبر ۱۹۳۷ء ج ۱۱ عدد ۳) اس مضمون میں داؤد اکبر اصلاحیؒ نے یہ ثابت کیا ہے کہ شکر اسلامی زندگی کے لیے باعث حیات اور دینی و دنیاوی ترقیوں کی اساس ہے۔

۴۔ لفظ فتنہ اور قرآن مجید (معارف جلد ۵۹ عدد ۴۔۵ ماہ اپریل و مئی ۱۹۴۷ء) اس مضمون میں قرآن مجید کے استعمالات کی روشنی میں لفظ فتنہ کے معانی کی وضاحت کی گئی ہے۔

۵۔ حضرت موسیٰؑ کے واقعۂ ایذا رسانی اور برأت کی تحقیق (ماہنامہ برہان جلد ہفتم شمارہ ۳ شوال ۱۳۶۵ھ / ستمبر ۱۹۴۶ء) اس مضمون میں سورہ احزاب کی آیت ﴿ یا ایھا الذین آمنوا لا تکونوا کالذین آذوا موسیٰ فبرّاہ اللہ مما قالوا و کان عنداللہ وجیھاً ﴾ کی تفسیر و توضیح کی گئی ہے اور اس میں مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ نے مفسرین کے اس عام قول کی تردید کی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو کوئی جسمانی عارضہ لاحق تھا جس کی برأت کا ذکر اس آیت میں ہے۔ بلکہ انھوں نے نظام سورہ اور سیاق کلام سے یہ ثابت کیا ہے کہ اس میں قوم موسیٰ کے منافقین کی شرارتوں کا ذکر کر کے عہد نبوی کے منافقین کو سرزنش اور تنبیہ کی گئی ہے۔

۶۔ قصیدہ قفانبک کی شرح قرآن مجید کی روشنی میں (ماہنامہ ندیم گیا ۱۹۴۷ء) یہ مضمون کئی شماروں میں بالاقساط شائع ہوا ہے اور اس میں کلام جاہلی کے اسلوب بیان کی مماثلت دکھاتے ہوئے بعض قرآنی الفاظ کا مفہوم کلام عرب کی روشنی میں متعین کیا گیا ہے۔

۷۔ قیومت کبری (مجلہ نشاۃ نو مولانا آزاد تعلیمی مرکز اسرہٹہ جونپور) اس مضمون میں سورہ نبا کی تفسیر کی گئی ہے۔

مولانا داؤد اکبر اصلاحی کے بعض مضامین صدق (لکھنؤ) اور فاران (بجنور) میں بھی شائع ہوئے مگر اسکی تفصیل راقم الحروف کو دستیاب نہیں ہو سکی، اور پھر اسکی تلاش و تعین اس لیے بھی دشوار ہے کہ ان رسالوں میں ان کے بعض مضامین ان کے نام سے نہیں چھپے ہیں۔

مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ نے ۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۷ء میں اپنے منتخب قرآنی مضامین کا ایک مجموعہ "مشکلات القرآن" کے نام سے طبع کرایا جو دانش گاہ پنجاب مزنگ لاہور سے شائع ہوا ہے، اس مجموعہ میں الاصلاح، ترجمان القرآن اور برہان کے مضامین کے علاوہ درج ذیل مضامین کا اضافہ ہے۔

۱۔ ذبح بقرہ اور قتل نفس کے واقعہ کی تحقیق　　۲۔ سورہ اعراف کی ایک آیت اور اس کی تاویل
۳۔ سورہ صافات کی قسمیں　　۴۔ ق والقرآن المجید کے متعلق سوال اور اس کا جواب
۵۔ سورہ طور کی قسمیں　　۶۔ سورہ قمر کی ایک آیت کے متعلق سوال اور اس کا جواب

ان کی ایک کتاب "قرآن مجید کا چیلنج" ۱۹۲۷ء میں دائرۃ المصنفین ہلال بھڈپو مبارکپور سے شائع ہوئی، جس کو ان کے ایک عزیز اور ہم وطن مولانا نجم الدین احیائی مرحوم نے شائع کرایا۔ اس کتاب میں انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید کا اعجاز محض عربی زبان اور اس کے اسلوب ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا اصل اعجازی پہلو اس کی معنویت میں پنہاں ہے اور اس کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید کا اعجاز محض کسی مخصوص خطہ اور دور تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ پورے عالم کے لیے اور ہر زمانے کے لیے ہے۔

مولانا داؤد اکبر اصلاحی نے مولانا نجم الدین احیائی مرحوم کی خواہش اور اصرار پر سعودی عرب کی جانب سے منعقد بین الاقوامی مقابلہء سیرت کے لیے بھی ایک مضمون لکھا تھا، اس کا مقدمہ نہایت جامع اور اہم ہے جس میں انھوں نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ بالعموم سیرت نگار مناقب و فضائل کے ذکر میں انبیاء کے درمیان تقابل کر بیٹھتے ہیں جس سے یک گونہ تفریق بین الرسل کی بو آتی ہے، انھوں نے اس مقدمہ میں یہ ثابت کیا ہے کہ تمام انبیاء کی دعوت اور ان کا مشن ایک تھا، ان کی شریعتوں میں ضرور جزوی فرق رہا مگر دین سب کا ایک تھا اس لیے سیرت نگاری میں اس پہلو کو خاص

طور پر مد نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ کا یہ مضمون غالباً رابطہ عالم اسلامی کے دفتر سے ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کو حاصل ہوا، اور اس وقت وہ ماہنامہ فکر و نظر اسلام آباد کے مدیر تھے، چنانچہ انھوں نے اس مقدمہ کو "مطالعہء سیرت۔۔۔ سلسلہء انبیاء کے تناظر میں" کے عنوان سے فکر و نظر کے شمارہ ۱۰۰ جلد ۲۱ بابت ماہ شعبان ۱۴۰۴ھ / مئی ۱۹۸۴ء میں شائع کیا۔

مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ کے انتقال کے بعد ان کے کاغذات میں راقم الحروف کو دو مضامین ایسے دستیاب ہوئے جن کے بارہ میں میرا اندازہ یہ ہے کہ وہ ان کی زندگی میں کہیں شائع نہیں ہوئے، چنانچہ یہ دونوں مضمون مجلہ حیات نو میں اشاعت کے لیے دیے گئے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ غزوہء بدر پر ایک بار اور نظر (حیات نو ماہ اگست ۱۹۸۷ء) اس مضمون میں انھوں نے سورہ انفال کی آیت واذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین" کی بالکل انوکھی اور منفرد تفسیر کی ہے اور علامہ شبلی نعمانی نے اپنی مشہور تصنیف "سیرۃ النبی" میں غزوہ بدر کے سلسلہ میں جو موقف اختیار کیا ہے اس کی تائید بہم پہنچائی ہے۔

۲۔ دینی درسگاہوں کے نظام تعلیم اور طریقہء تعلیم پر ایک نظر (مئی ۱۹۹۰ء و نومبر ۹۲ء) اس مضمون میں مطلوبہ اسلامی نظام تعلیم کی اہمیت اور ضرورت اجاگر کی گئی ہے۔

(بقیہ مولانا نور محمد صاحب کے اوصاف حسنہ)

انجمن طلبہ قدیم کی خدمت

فارغین جامعہ کی انجمن جو ملک اور بیرون ملک متعارف ہے اور مدارس کے درمیان ایک فعال اور سرگرم انجمن کی حیثیت سے ممتاز ہے۔ اس سے ان کا تعلق آغاز ہی سے تھا اور اس کے استحکام میں انھوں نے نمایاں رول ادا کیا۔ شوری کے ممبر رہے۔ ذمہ دارانہ مناصب پر فائز رہے۔ انجمن کے ترجمان "ماہنامہ حیات نو" کے مدیر مسئول کی حیثیت سے اہم خدمت انجام دی۔ انجمن کی مختلف شاخوں کا دورہ کر کے اس کو فعال بنانے میں اہم کردار انجام دیا۔ ان کی ذات انجمن کے مقاصد کا مرقع تھی۔ فارغین سے گہرا ربط، ان کو جامعہ کی طرف متوجہ کرنا، ان کے اندر دعوتی جذبہ بیدار رکھنے کی کوشش اور ان کے مسائل سے دلچسپی اور حل کی فکر، یہ سب خوبیاں ان کے اندر موجود تھیں۔

اللہ تعالی سے دعا ہے مرحوم کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات کو بلند کرے اور انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین۔ ☆

مولانا نور محمد فلاحی ایک نظر میں

آفتاب عالم فلاحی

نام :نور محمد

نسب :نور محمد بن عبدالجبار ابن تفضّل حسین بن شجاعت علی خاں

والد کا نام :حاجی عبدالجبار صاحب

والدہ کا نام :زہرہ خاتون

تاریخ پیدائش :۱۰ر ستمبر ۱۹۵۲ء

وطن :زمین رسول پور، اعظم گڑھ، یوپی۔

ننھیال :نتھوپٹی، چاندپٹی اعظم گڑھ

مستقل سکونت :زمین رسول پور

عارضی سکونت :بلریاگنج، اعظم گڑھ

تعلیم :ابتدائی تعلیم مدرسۃ النجاح، زمین رسول پور

ثانوی تعلیم اور عالمیت و فضیلت جامعۃ الفلاح، بلریاگنج، اعظم گڑھ

تاریخ داخلہ جامعۃ الفلاح ۱۸/۱/ ۱۹۶۷ء، فراغت ۱۶/ ۱۲/ ۱۹۷۰ء

ادیب، ادیب ماہر، ادیب کامل جامعہ اردو علی گڑھ

بی ایڈ (دورہ تدریبیہ) جامعۃ الملک سعود

شادی :۱۹۷۳ء

تدریسی سفر مدرسۃ النجاح زمین رسول پور

چھندواڑہ، حیدرآباد

جامعۃ الفلاح، بلریاگنج، اعظم گڑھ (۱۹۷۵ء-۱۹۹۵ء)

تحریکی سفر تاحیات جماعت اسلامی کے رکن رہے۔ مقامی جماعت رسول پور کی فکری رہنمائی برابر کرتے رہے۔

صحافتی سفر حیات نو جامعۃ الفلاح کے مدیر مسئول رہے، لیل و نہار ایک عرصہ تک آپ ہی کے قلم سے آتا رہا

ذمہ داریاں :امیر مقامی جماعت اسلامی ہند زمین رسول پور

حیات نو جامعۃ الفلاح کے مدیر مسئول۔

انجمن طلبہ ء قدیم کے سکریٹری۔

ممبر مجلس تعلیمی مدرسۃ النجاح زمین رسول پور (از ۱۹۷۵ء تا وفات)

ممبر مجلس تعلیمی مدرسہ جگدیش پور (از تشکیل تا وفات)

جامعۃ الفلاح کے نگران اعلیٰ

ناظم اعلیٰ جامعۃ الفلاح کی معاونت

سفر عمرہ : ۱۹۹۰ء

تاریخ وفات : ۱۰ر فروری ۲۰۰۰ء (نماز جنازہ جناب مولانا محمد طاہر مدنی صاحب نے

پڑھائی) اہم اساتذہ : مولانا جلیل احسن ندوی مرحوم، مولانا شبیر احمد اصلاحی، مولانا

عبدالحسیب اصلاحی، مولانا صغیر احسن اصلاحی، مولانا شہباز احمد اصلاحی، مولانا

ابوبکر اصلاحی ، ماسٹر افضال احمد مشہدی۔

وہ شخصیات جن سے : مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا صدرالدین اصلاحی، مولانا محمد یوسف آپ

متاثر ہوئے اصلاحی، مولانا ابوالليث اصلاحی، مولانا شہباز اصلاحی،

اولاد :لڑکے : ۱۔ آفتاب عالم، ۲۔ رضوان احمد، ۳۔ فیضان احمد۔

لڑکیاں : ۱۔ بشریٰ بانو، ۲۔ بشریٰ بانو

(ایک لڑکی بشریٰ اپنے بچپن ہی میں اللہ کو پیاری ہوگئی تھی)

پسندیدہ غذا :سرکہ، موٹی روٹی، چٹنی اور شہد۔ ☆

مولانا نور محمد صاحب ؒ کا بچپن

قمر رسول پوری

زمین رسول پور، اعظم گڑھ

مولوی نور محمد صاحب فلاحی میرے بہت ہی قریب کے پڑوسی تھے میرے گھر اور ان کے گھر کے درمیان چند گز کا فاصلہ ہے۔ یہ مجھ سے عمر میں بہت چھوٹے تھے مجھے اچھی طرح یاد ہے جب ان کے والد محترم عبدالجبار صاحب انھیں میرے گھر لے آئے اور میری والدہ محترمہ سے کہا کہ بھابھی اس بچے کو ناظرہ پڑھا دیجئے، میری والدہ تولے محلے کے چھوٹے بچے اور بچیوں کو ناظرہ کلام پاک پڑھاتی تھیں، ان دنوں ان کی عمر چار پانچ سال رہی ہوگی۔ میری سب سے چھوٹی بہن شاہ جہاں بانو جو شاہد بدر فلاحی اسلامک مومنٹ آف انڈیا کے صدر ہیں ان کی والدہ تھیں جو ۱۴؍ مئی ۱۹۷۶ء کو داغ مفارقت دے گئیں ان کی ہم عمر تھیں اور انھیں کے ساتھ پڑھتے تھے۔

مولانا بچپن ہی سے بڑے نیک اور صالح تھے کبھی میں نے ان کو ہم عمر بچوں سے لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھا اگر کوئی بات ہو جاتی تو ہنس کر ٹال جاتے۔ بچپن سے جوانی تک کبھی میں نے ان کو گالی گلوج کرتے نہیں سنا۔ گورا چٹا رنگ قد پانچ فٹ نو انچ سے نکلتا ہوا بھرا ہوا جسم، دیکھنے میں ایک خوبصورت جوان معلوم ہوتے تھے۔

مجھے ان کے بچپن کا ایک واقعہ یاد ہے کہ اپنے ہم مکتب بچوں کے ساتھ چکنی مٹی کا ڈھیلا لیکر آرہے تھے جسے گھر میں عورتیں لیپنے پوتنے کے لیے استعمال کرتی ہیں کہ میرے بیٹھک کی دہلیز پر گر پڑے میں نے کہا بابو اپنی اوقات دیکھ کر ہی بوجھ اٹھاؤ تو کہنے لگے کہ فلاں لڑکا مجھ سے بڑا ڈھیلا لا رہا تھا تو میں کم ہوں؟ یہ جملہ ان کی حوصلہ مندی کا گواہ ہے۔

میں نے کہا یہ لڑکا آگے چل کر ضرور بلند مقام حاصل کرے گا۔

ہونہار بروا کے ہوت چکنے پات

مولانا نور محمد صاحب کے اوصاف حسنہ

مولانا طاہر مدنی

۱۰؍ فروری ۲۰۰۰ء کو مولانا نو محمد فلاحی طویل علالت کے بعد اس دار فانی سے کوچ کر گئے ان کی رحلت جملہ وابستگان جامعہ کے لیے ایک جانکاہ حادثہ ہے۔ ایک عرصہ تک انھوں نے جامعہ کی مختلف خدمات حسن و خوبی انجام دیں۔ ان کی شخصیت مختلف وجوہ سے بڑی دلکش اور پرکشش تھی یہی وجہ ہے کہ وہ اساتذہ، منتظمین، فارغین، اہل قریہ، اور محلہ سب میں ہر دلعزیز تھے۔ اس مختصر مضمون میں ان کی شخصیت کے چند اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

محبت اور ملنساری

مرحوم کی یاد کے ساتھ ان کا مسکراتا ہوا چہرہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ وہ تمام لوگوں سے محبت اور خندہ پیشانی سے ملتے تھے اور بڑے ملنسار واقع ہوئے تھے ان کے روابط بڑے وسیع تھے سب کا خیال رکھتے تھے اور تعلقات کو برابر قائم رکھنے کا اہتمام کرتے تھے۔ کوئی سخت بات کہہ دے تو بھی مسکراتے رہتے تھے۔ درحقیقت وہ محبت اور اپنائیت کی بیش قیمت سوغات برابر تقسیم کرتے رہتے تھے اسی وجہ سے ان کے چاہنے والوں کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔

تواضع اور انکساری

تواضع مومن کی پہچان ہے اور اللہ کے رسول نے یہ بشارت دی ہے کہ جو اللہ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالی اس کو بلند کر دیتا ہے۔ مرحوم کے اندر یہ صفت بدرجہ اتم موجود تھی۔ انتہائی خاکساری اور انکساری کا پیکر تھے۔ تکبر اور تعلّی سے کوسوں دور تھے۔ اپنے سے چھوٹوں کے ساتھ بھی خاکسارانہ رویہ اپناتے تھے۔ علم و فضل کا گھمنڈ ان کو کبھی نہیں ہوا۔ زیر درس مضامین کے سلسلے میں کوئی اشکال ہو تو بلا تکلف اپنے خوردوں سے بھی رجوع کر لیتے تھے۔ ایک اچھے مدرس کی یہ امتیازی شان ہے۔ کیونکہ غرور علمی شخصیت کے لیے تباہ کن مرض ہے۔

مشفقانہ تربیت

مرحوم ایک کامیاب مربی تھے۔ طلبہ کے ساتھ بڑا گہرا اور قریبی ربط رکھتے اور بڑی شفقت و محبت کے ساتھ ان کی تربیت کرتے تھے۔ طلبہ اپنے آپ کو ان سے بہت قریب محسوس کرتے تھے۔ اور بلا تکلف اپنے مسائل ان کے سامنے رکھتے تھے۔ طلبہ کے ساتھ گہری دلچسپی اور ان کے ساتھ مشفقانہ برتاؤ کی وجہ سے وہ طلبہ میں بہت مقبول تھے۔ وہ اپنے درس کی تیاری باقاعدہ کرتے تھے۔ اور طلبہ کو ہر ممکن طریقہ سے فائدہ پہونچانے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ مطالعہ کا اچھا ذوق تھا۔ ان کی ذاتی لائبریری میں کتابوں کا اچھا کلکشن ہے جس سے طلبہ بھی استفادہ کرتے تھے۔

جذبہ خدمت

مرحوم کے اندر خدمت کا جذبہ بہت نمایاں تھا۔ وہ مخدوم نہیں بلکہ خادم بن کر رہتے تھے اور ارباب مدارس کی عادت مخدومیت سے اللہ تعلیٰ نے انھیں محفوظ رکھا تھا۔ محلّہ اور گاؤں کے لوگوں کی مختلف خدمات ہنسی خوشی انجام دیتے تھے۔ اور سب کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے گاؤں کے لوگ بھی ان کو بہت چاہتے تھے اور کسی شخصیت کے لیے اصل کسوٹی قریبی ماحول ہوتا ہے کیونکہ "دور کے ڈھول تو سہانے ہوتے ہی ہیں"۔

مرحوم نے جامعہ کی بھی مختلف خدمات کی انجام دہی بہت حسن وخوبی کے ساتھ کی۔ تدریس کے علاوہ جامعہ کے حلقہ تعارف کی توسیع اور مالیات کی فراہمی میں بھرپور حصہ لیتے تھے اور اس کے خاطر ملک کے مختلف مقامات پر سفر کرتے رہتے تھے۔ ان پر بیماری کا شدید حملہ ایک ایسے ہی سفر کے دوران ہوا اور بالآخر ایک طویل علالت کے بعد وہ سب کو سوگوار چھوڑ کر اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ انکی ان خدمات کو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ ان کا جذبہ خدمت سب کے لیے مہمیز کا سبب بنتا رہے گا۔

تحریکی کارکن

مرحوم جماعت اسلامی ہند کے سرگرم رکن تھے۔ اور بڑی لگن کے ساتھ تحریک کی خدمت انجام دیتے رہے۔ خاص طور سے نوجوانوں میں تحریک کو متعارف کرانے اور اس کے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ وہ اپنی گاؤں کی جماعت کے امیر بھی رہے۔ ان کی امارت میں جماعت کے کام میں توسیع اور استحکام پیدا ہوا۔ ان کی وفات کی وجہ سے مقامی سطح پر جماعت میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے اور کام متاثر ہوا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۳ پر)

عالم اسلام پر فکری یلغار۔ غور و فکر کے بعض پہلو

غطریف شہباز ندوی
ریسرچ اسکالر جامعہ ملیہ

کسی شخص کو جسمانی طور پر زدوکوب کر دیا جائے، یہاں تک کہ اسے ادھ موا کر دیا جائے تب بھی اس کی سلامتی کی ضمانت دی جاسکتی ہے، علاج و معالجہ کے ذریعہ اس کی صحت بحال ہو سکتی ہے۔ لیکن جسمانی طور پر کسی توانا شخص کے ذہنی و فکری قوی زائل ہو جائیں یا زائل کر دیے جائیں تو یقیناً اس کا شمار برائے نام زندوں میں کیا جاتا ہے، اس کی حقیقی زندگی ختم ہو چکی ہوتی ہے، یہ چیز جس طرح ایک فرد کے بارے میں صحیح ہے اسی طرح ایک قوم و ملت پر بھی صادق آتی ہے۔ بطور خاص امت مسلمہ کے تناظر میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ دشمن نے اسے تاراج کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، اس کی حکومتیں تباہ کر دی گئیں، آبادیوں کی آبادیاں ختم کر دی گئیں، مادی زندگی کے وسائل و ذرائع نابود کر دیے گئے، تاہم اس کی فکری علمی و ذہنی قویٰ، گرچہ کسی قدر کمزور پڑ گئے تھے، لیکن محفوظ تھے لهذا امت ہر بار آگ و خون کے طوفان سے سرخرو ہو کر نکل آئی، لیکن عیار دشمن نے امت مسلمہ کی اس خصوصی سخت جانی کا اندازہ پہلی صدی ہجری ہی میں کر لیا تھا جس پر ایقان انھیں اسی وقت ہو گیا جب امت نے زوال بغداد کے بعد دوبارہ سنبھالا لے لیا۔ اب انھوں نے ایک نہایت خفیہ اور زیر زمین اسٹریٹجی تیار کر کے ایک ہمہ گیر فکری یلغار کی، جس نے اسلامی زندگی کے کم وبیش ہر شعبہ کو متاثر کیا، ہماری اس بات کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ عالم اسلام کے سارے مسائل کی تمام تر ذمہ داری خارجی اثرات اور بیرونی سازشوں کے سر ڈال دیں، یقیناً ہماری داخلی کمزوریاں بھی کم نہیں ہیں، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خارجی عوامل زیادہ اثرانداز ہوئے ہیں۔

اس فکری یلغار سے ہمارے ثقافتی ورثہ کا ہر شعبہ متاثر ہوا، تفسیر اور حدیث کے ذخیروں میں اس کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں، تاہم سب سے زیادہ جس فن کو تختہء مشق بنایا گیا اور دراندازی کی گئی

وہ تاریخ ہے کہ بعض اوقات اس کا حلیہ ہی بگاڑ کر رکھ دیا گیا، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ سید قطب شہید کہا کرتے تھے "تاریخنا لم یکتب بعد" (ہماری تاریخ ابھی لکھی ہی نہیں گئی) تاریخ کے سلسلہ میں انھوں نے یہ رویہ بہتیرے مغالطے پیدا کیے ہیں، اور ان کو اتنا عام کیا ہے کہ آج وہ ایک مسلمہ حقیقت سمجھے جاتے ہیں، ان میں چند بڑے مغالطے کچھ اس طرح ہیں، (۱) اسلامی تہذیب کا ارتقاء دور عباسیہ میں ہوا، وہی اس کا دور عروج ہے۔ (۲) مغربی استعمار کی یلغار کے وقت عالم اسلامی فکری، علمی اور تہذیبی طور پر زوال کا شکار ہو چکا تھا۔ (۳) جدید تہذیب اصلاً اسلام مخالف نہیں ہے۔ (۴) خارجی سازش اور بیرونی حملوں کی بات دراصل بعض ذہنوں کی اپج ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، اس لیے مسلمانوں کو اصل توجہ داخلی اصلاح پر دینی چاہیے۔ آئندہ سطور پر انھیں چار نکتوں پر روشنی ڈالی جارہی ہے۔

۱۔ جہاں تک پہلا مسئلہ ہے تو یہ بات اتنے زور و شور کے ساتھ کہی گئی کہ عالم اسلام کا سارا دانشور اور پڑھا لکھا طبقہ اسی سے مسحور ہو گیا، جس میں قدیم طرز کے علماء بھی تھے اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی، لیکن جس قدر شدت کے ساتھ یہ بات پھیلائی گئی واقعہ یہ ہے کہ وہ اتنی ہی بے بنیاد ہے، یہ دراصل مغرب کا دیا ہوا تجزیہ ہے، مستشرقین نے بہت سوچ سمجھ کر اور اس کے اثرات کا اندازہ کر کے ایک علمی تحقیق کے طور پر یہ بات کہی، اور جب یہ بات کہی گئی اس وقت پورا عالم اسلام تقریباً مغربی استعمار کا غلام ہو چکا تھا، لہٰذا جب یہ بات موسیو لیبان وغیرہ نے کہی کہ جدید تہذیب اس علمی تحریک کا براہ راست نتیجہ ہے جس کے تحت عربوں نے خلافت عباسیہ اور امارت اندلس کے زمانہ میں یونانی علوم و فنون کو عربی میں منتقل کیا، اور یہیں سے پھر طلیطلہ اور صقلیہ کے مراکز ترجمہ میں اس سرمایہ کو یورپ کی زبانوں میں نقل کر لیا گیا اور اس طرح نشأۃ ثانیہ (The Renaissance) کی داغ بیل پڑی تو اس بات سے مسلمانوں کی فخر کی نفسیات کو تقویت ملی اور انھوں نے خوشی خوشی اس تجزیہ کو قبول کر لیا، حالانکہ مغربی علماء جب یہ بات کہتے ہیں کہ اسلامی تہذیب نے دور عباسیہ میں عروج پایا، اور اس کی بنا یونانی علوم کے ترجمہ کی تحریک بنی، اور اس کا ارتقاء ابن سینا، فارابی، ابن الہیثم، اور ابن رشد وغیرہ کے ہاتھوں ہوا، تو دراصل وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عہد نبوی اور عہد خلافت راشدہ میں اسلامی تہذیب و تمدن اپنے ابتدائی دور میں تھے، یہیں سے وہ دین اور تہذیب میں فرق کرنا چاہتے ہیں، اور یہیں سے

[illegible] کی تحریک کو قوت ملتی ہے، اور دین و دنیا کے نظریہ کو تقویت دی جاتی ہے۔

مغربی پروپیگنڈہ کے اساتذہ کا کمال ہے کہ انھوں نے اس تجزیہ کو موجودہ مدون اسلامی تاریخ کی ایک جانی بوجھی حقیقت قرار دیا، اور اب اس کے خلاف کچھ کہنا علم و تحقیق کے خلاف سمجھا جاتا ہے، انگریزی میں سید امیر علی نے، عربی میں احمد امین نے اور اردو میں علامہ شبلی نے اس خیال کو اپنی تحریروں میں جگہ دی، چنانچہ عربی اور اردو میں اسلامی تہذیب کی تاریخ سے متعلق جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ اسی کو بنیاد بنا کر لکھا جاتا ہے، ا۔ اجبکہ عہد اموی اور عباسی کے ان عربی مترجمین و ناقلین میں بیشتر اور اہم تر درجہ رکھنے والے یہودی مترجمین تھے، اسرار عالم لکھتے ہیں "اس فہرست (مترجمین کی مشہور فہرست) کو دیکھ بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کام میں عیسائی پیش پیش تھے لیکن چند ایسے سوالات ابھرتے ہیں جو اس صورت حال کو مشکوک بنا دیتے ہیں۔ ا۔ بازنطینی سلطنت میں یہ علوم سرد خانوں میں تھے اور ان پر عیسائی کلیسا کے اثرات کے سبب پابندی تھی۔ ۲۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تراجم عیسائی لوگوں کے ذریعہ ہوئے جن کے مراکز مصر اور شام میں تھے، جبکہ یہ کام عموماً ان مقامات پر بھی ہوتے جو موجودہ عراق کے علاقے کہلاتے ہیں، جہاں بڑی تعداد میں یہودی آباد تھے، (صفحہ ۱۱۹) آگے لکھتے ہیں، حیرت اس وقت ہوتی ہے جب خالص یہودی ذرائع کا جائزہ لیا جاتا ہے وہاں یہ بات ابھری نظر آتی ہے کہ اس سلسلے میں عیسائیوں نے کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہیں دیا اور اس طرح کے کام یا تو یہودیوں نے کیے یا ایرانیوں و یونانیوں نے" چنانچہ مشہور یہودی مصنف میکس آئی ڈیمنٹ لکھتا ہے "عیسائی جو تعداد میں یہودیوں سے کئی گنا تھے اسلامی مملکت میں کوئی عظیم فرد یا ممیز ثقافت پیدا کرنے سے قاصر رہے، دوسری طرف یہودیوں نے اس دور میں ایک زرین عہد پیدا کیا، جس نے فلسفہ، طب، سائنس، ریاضی اور لسانیات غرض زندگی کے ہر شعبہ میں عظیم لوگ پیدا کیے۔"[۲]

کسی بھی تہذیب کی روح اور اصل اس بات پر ہے کہ کائنات، انسان اور خدا کے بارے میں اس کا تصور کیا ہے، وہ انسانی وجود کو اس دنیا میں کس نظر سے دیکھتی ہے، اور اس کا مقصد زندگی کیا متعین کرتی ہے، یہیں سے وہ عناصر تشکیل پاتے ہیں جن سے اس کے خلیے بنتے ہیں اور جو اس کے جسم میں رواں دواں رہتے ہیں، یعنی عقیدہ، فکر، علم اور ذہنی و صلاحیتی امور، انھیں عناصر کی بنیاد پر اس تہذیب کے خصائص، دوسرے لفظوں میں ثقافتی اخلاق کی تشکیل ہوتی ہے۔ یعنی معیشت و

معاشرت، آرٹ، فنون ملبوسات، مشروبات، تعمیراتی ورسمی روایات اور قومی فضائل وغیرہ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو اسلامی تہذیب کی بنیادیں دور نبوی میں پختہ اور مضبوط ہو چکی تھیں اور وہ اپنے روحانی و مادی عروج پر پہنچ چکی تھی، خلافت راشدہ اسی عروج کی توسیع تھی، اسی لیے خلافت راشدہ کو متمم دور نبوت کہا جاتا ہے، حتی کہ صحیح حدیث سے بھی ایسی بات کی تائید ہوتی ہے۔[2] بعد کے ادوار میں روحانی طور پر اس کے اثرات و ثمرات ظاہر ہوتے رہے، لیکن بیرونی سازشوں، دخیل عناصر اور داخلی اقتدار کی کشمکش کی وجہ سے اس کے مظاہر میں زوال آنا شروع ہو گیا حتی کہ ۱۹۲۴ء میں اس کا شیرازہ بالکل ہی بکھر گیا۔

بنو امیہ کے آخری دور اور بنو عباس کے ابتدائی ادوار میں یونانی علوم و فنون کے ترجمہ کی وجہ سے اسلامی تہذیب نے حکمت عملیہ (طب، ریاضیات اور ہندسہ وغیرہ) میں اس سے استفادہ کیا، اور ان شعبوں کو غیر معمولی ترقی دی، جبکہ منطق و فلسفہ وغیرہ سے نقصان ہی نقصان ہوا، انھیں کے مفاسد تھے جن کی وجہ سے امت واحدہ مختلف کلامی فرقوں اور دھڑوں میں بٹ کر رہ گئی، اور یہ ساری بحثیں اسی وقت شروع ہوئیں جب امت میں روح جہاد و اجتہاد سرد پڑ چکی تھی، یہی وجہ ہے کہ خلیفہ مامون، جو ترجمہ کے اس کام کا سب سے بڑا سرپرست تھا، کے سلسلہ میں محققین علماء امت ہمیشہ سخت موقف اپناتے رہے۔[3] لہذا یہ کہنا کہ عصر عباسی میں اسلامی تہذیب نے عروج پایا، ایک بے بنیاد دعوی ہے جو پروپیگنڈہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، جبکہ اسلامی علوم و فنون (تفسیر، حدیث، ادب و لغت وغیرہ) کی تدوین کا کام ترجمہ کی اس تحریک سے بہت پہلے ہی شروع ہو چکا تھا، پھر یہ بات تو com-mon sence کے بھی خلاف ہے کہ ایک پوری قوم کی تہذیب کے ارتقاء کو صرف چند ایسے لوگوں کے سر منڈھ دیا جائے، جن میں سے بیشتر کی تو اس سے وفاداری بھی مشکوک ہے۔[4] اسی طرح یہ خیال بھی اتنا عام کر دیا گیا ہے کہ عالم اسلام فکری، ذہنی، علمی، صنعتی اور اقتصادی طور پر زوال کا شکار ہو چکا تھا، جس کے نتیجے میں مغربی استعمار کا غلام ہو گیا، کہ اب اس کو ایک مسلمہ حقیقت سمجھا جاتا ہے، اور مسلمانوں کے عروج و زوال سے متعلق جتنی باتیں کہی جاتی ہیں ان میں سرفہرست یہی تجزیہ ہے، جدید دور میں عربی اردو میں اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں ساری بنیاد اسی بات پر رکھی گئی ہے، اس کے لیے صرف امیر البیان شکیب ارسلان کی کتاب " لماذا تاخر المسلمون و تقدم غیرھم "

(مسلمانوں کی پسماندگی اور غیروں کی ترقی کا سبب) دیکھ لی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ مسلمان اہل فکر اپنے عروج و زوال کا تجزیہ کس طرح کرتے آرہے ہیں، حالانکہ کلیۃ یہ بات صحیح نہیں، یقیناً خلافت راشدہ کے بعد سے ہم زوال آمادہ ہیں، لیکن اس معنی میں ہرگز نہیں جس میں ہماری جدید تاریخ ہمیں باور کراتی ہے، اگر علمی و فکری اور معاشی طور پر عالم اسلام کے زوال سے دوچار ہو جانے کی بات صحیح ہے تو آخر برطانیہ کے ہاؤس آف کامنس کے جواب میں ٹامس منرو (Thomas Manu) کو اس سلسلہ میں کہ انگلینڈ کے ماڈرن کپڑے ہندستان میں کیوں نہیں بکتے، یہ کہنے کی کیا ضرورت پڑی تھی کہ I am af-raid excellence of their own manufactures (مجھے ڈر ہے کہ ان کے مصنوعات کی عمدگی اس کا سبب ہو) ۔۔۔ واضح رہے کہ یہ بات ۱۸۱۳ء کی ہے، جب فرانس اور انگلینڈ میں صنعتی انقلاب آچکا تھا، اور پورا یورپ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا، (ملاحظہ ہو عالم اسلام کی اقتصادی صورت حال صفحہ ۴۰) اصل بات یہ ہے کہ اقتصادیات اور صنعت میں ہم ہر طرح ترقی یافتہ ہونے کے باوجود سازشوں کا شکار ہوتے ہیں، اور ہماری اقتصادیات تباہ کی گئی ہے، عالم اسلام میں اس وقت بہتیرے زرخیز دماغ پیدا ہوتے اور سارے علمی کام جاری تھے، المیہ یہ ہے کہ مغرب عالم اسلام کو اپنی سازشوں کے ذریعہ سے بے دست و پا کرنے اور باندھ کر ڈالنے میں کامیاب ہو گیا اور اس کے بعد ہماری تاریخ کو افرنگی نظریہ کے تحت مسخ کیا جانے لگا، تعلیمی محاظ پر دیکھیں تو انگریز کی آمد سے قبل مسلم ہندستان میں تعلیم کا ایک مستحکم اور خود کار نظام کام کر رہا تھا، حتی کہ یہاں کے علماء مغربی علوم و فنون اور زبانیں تک سیکھ رہے تھے۔[6]

ان کا نصاب دینی و دنیوی دونوں مضامین کو جامع تھا، اسی لیے جہاں علماء، قاضی اور مفتی ملتے تھے وہیں ایڈمنسٹریٹر اور سول سروس کے لوگ بھی حاصل ہوتے تھے، اسکی ذرائع آمدنی میں اوقاف کا بڑا رول تھا، میکس مولر کی تحقیق کے مطابق صرف بنگال میں ۸۰ ہزار مدارس پائے جاتے تھے یعنی ہر چار سو کی آبادی پر ایک تعلیم گاہ۔[7] لیکن انگریزوں نے اس پورے نظام پر مختلف مراحل میں کاری ضربیں لگائیں اور اسے بالکل ہی نیم جان کر دیا، اوقاف ضبط کر لیے[8]، زمین داری سسٹم کا خاتمہ کر دیا، اور مسلمانوں کو ہر طرح سے جاہل، قلاش اور مفلس بنا دینے کی پالیسی اختیار کی، غیروں کے کم سے کم اعترافات بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں، مسٹر کارڈس نے ۱۸۳۲ء میں پارلیامنٹ سب کمیٹی کے

سامنے شہادت دیتے ہوئے کہا کہ ہندستان کی ذہانت بعض صنعتوں میں بے نظیر ہے، ململ، شال، چکن، ریشمی رومال، سونے چاندی اور ہاتھی دانت کا کام اتنا نفیس اور لاجواب ہوتا ہے کہ برطانوی صناع اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا(ملاحظہ سید ابوالخیر مودودی، ہندوستان کی معاشی حالت بحوالہ المعارف لاہور صفحہ ۲۴ اپریل جون ۱۹۹۸ء)لارڈ میکالے بنارس کے ریشمی کپڑوں کی تعریف میں کہتے ہیں "وہ اتنے اچھے ہوتے ہیں کہ لوگ سینٹ جیمز اور سلز کے رقص خانوں میں انھیں فخریہ پہن کر جاتے ہیں" (ایضا) پروفیسر لیکی نے لکھا "سترہویں صدی کے نصف آخر تک انگلینڈ میں ہندستانی ململ، چھینٹ اور باریک خاص قسم کے چھپے ہوئے کپڑوں کی اتنی مانگ تھی کہ اس کی وجہ سے انگلینڈ کے اونی اور ریشمی جلاہوں کی روزی خطرے میں پڑ گئی" (ایضا) ۱۹۱۸ء میں ہندستانی صنعتوں سے متعلق تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی جس کا آغاز ہی یوں تھا "کہ جب مغربی تاجروں نے پہلے پہل یہاں قدم رکھا تو اس وقت یہاں کی صنعتی حالت یورپ کی کسی ترقی یافتہ قوم سے کم نہ تھی" (ایضا) انگریز نے یہاں کیا کیا ایف.جی شور کہتا ہے "ہماری حکومت کا مقصد ہر ممکن طریقہ سے ہندستان کو لوٹنا اور اپنا پیٹ بھرنا ہے اور اس کے زیادہ سے زیادہ محصولوں کے بوجھ کے نیچے دبا دینا ہے" (ایضا) ہندوستان کی دولت نے کس طرح انگریز کے نقد قومی سرمایہ میں غیر معمولی اضافہ کر دیا تھا، اس بارے میں بروکس آدم لکھتا ہے "انیسوین صدی کو جس حرفتی انقلاب نے اپنے ماقبل سے جدا کر دیا وہ ۱۷۶۰ء سے شروع ہوتا ہے جبکہ پلاسی کی جنگ ختم ہوئی، یہ انقلاب جتنی تیزی سے شروع ہوا اسکی نظیر ملنی مشکل ہے۔ شاید اس دنیا میں آج تک کسی قوم کو کسی کام نے اتنا فائدہ نہیں پہنچایا جتنا فائدہ انگلینڈ کو ہندوستان کی دولت نے پہنچایا ہے،[9] یہ صرف مسلم ہندوستان کی صحیح صورت حال تھی اور وہ بھی مغلیہ دور کے عہد عروج میں نہیں بلکہ اس وقت جب حکومت کی باگ ڈور اورنگ زیب کے نااہل جانشینوں کے ہاتھ میں تھی اور پورا ملک بد امنی اور طوائف الملوکی کا شکار تھا، ہندوستان کے علاوہ باقی عالم اسلام کا حال بھی کم و بیش ایسا ہی تھا اور وہاں بھی فرانسیسی اور اطالوی استعمار نے وہی طریقے آزمائے جو انگریز نے ہندوستان میں، ہندوستان کی تجارت کو بند کر دیا گیا، اس کی صنعتوں کو مٹا دیا گیا، ہندوستانی مال پر دس فیصدی سے لیکر سو فیصدی تک کے محصول عائد کر دیے گئے۔ ڈھاکہ، مرشداباد، سورت وغیرہ کی صنعتیں تباہ کر دی گئیں، ولسن لکھتا ہے "یہ ایک واقعہ ہے کہ انگریزی صنعت کو فروغ دینے کے لیے ہندوستانی صنعت کو انتہائی ناانصافی سے مٹایا گیا ہے، اگر برطانوی کاریگر ہندوستانی کاریگر سے صرف کاریگر کی حیثیت سے مقابلہ کرتا تو ہرگز کامیاب نہ ہو سکتا" (ایضا)

زراعت کو بطور خاص نشانہ بنایا، شدید مال گزاری وصول کی گئی، قحط کے زمانوں میں بھی جبکہ آبادیاں پوری کی پوری اجڑی جا رہی تھیں لگان کی وصولیابی کے لیے مار پیٹ کی جاتی تھی، اس کے تباہ کن اثرات کے سلسلہ میں کرنل برگس لکھتا ہے "ایسی مال گزاری جو آج کل ہندوستان میں مقرر ہے جو زمین دار کی پوری آمدنی چٹ کر جاتی ہے یورپ یا ایشیا کی کسی حکومت میں کبھی نہیں دیکھی گئی"، (حوالہ مذکور المعارف صفحہ ۳۲) درست بات یہ ہے کہ عالم اسلام کی قوت حاکمہ سازشوں کے ذریعہ ختم کر دی گئی اور اس کے بعد علمی، سائنسی اور صنعتی زوال اس پر مسلط کر دیا گیا، ورنہ بقول اسرار عالم "واقعہ یہ ہے کہ اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں جتنے بڑے اور اونچے علمی، فنی، سائنسی اور صنعتی کارنامے عالم اسلام میں ہو رہے تھے مغرب میں ہونے والے کارنامے ان کے پاسنگ بھی نہیں، ہاں آج ان پر تاریخ کی گرد پڑ چکی ہے، اور ہماری ذہنی مرعوبیت نے انھیں اور ذلیل کر دیا ہے، ورنہ اس عہد میں عالم اسلام میں کام کرنے والی رصد گاہوں اور مغرب کی رصد گاہوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ تنہا شاہ کلیم علیہ الرحمہ کے گھرانے میں Mathematics اور Physics,Astro Physics کی جو تصنیفات ہو رہی تھیں ان کا کیا کوئی جواب اس وقت کی یوروپین تصنیفات میں ہے؟"[10]

اسی طرح اب یہ بات بھی نہایت شد و مد کے ساتھ کہی جا رہی ہے کہ جدید تہذیب اسلام مخالف نہیں ہے، فی الوقت بیشتر مفکرین اور اہل علم یہ کہہ رہے ہیں کہ اس تہذیب میں چند ہی پہلو نقصاندہ ہیں، بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر اس سے عریانیت کے عنصر کو نکال دیا جائے تو وہ عین اسلامی تہذیب ہے، بیسویں صدی کے چند نامرعوب مسلم مفکرین نے جدید تہذیب پر شدید تنقیدیں کی ہیں مثلا علامہ اقبال جنھوں نے کہا ؎

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

آج بہتیرے لوگ جن میں تحریکات اسلامیہ سے وابستہ افراد بھی ہیں ان مفکرین پر تنقید کر رہے ہیں اور ایسا تین اسباب کی وجہ سے ہے۔ ا۔ عالم اسلام کے بیشتر ملکوں میں جو جبر و استبداد کی حکومت ہے، جس نے لوگوں کے ضمیروں پر پہرے بٹھا دیے ہیں اور اظہار رائے کے حقوق سلب کر

رکھے ہیں اور ہر اعتبار سے اسلام پسندوں کا گلا گھونٹا جا رہا ہے، اس وحشیانہ پن کی روداد نہایت المناک اور خوں چکاں ہیں، مسلم قیادت کی اسلام سے اس بے وفائی نے ان اسلام پسندوں کو مغرب میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا، جہاں مسلم ممالک کے بر خلاف انھیں بہت سی آزادیاں مل گئیں، تو اب انھوں نے مغربی تہذیب سے متعلق اپنے رویہ پر نظر ثانی کی۔

۲۔ دوسرے سیکولرائزیشن اور ریشنلائزیشن (Rationalization) کی جو قوتیں عالم اسلام میں سر گرم عمل تھیں ان کے نہایت شدید اثرات مسلم دنیا نے قبول کیے۔

۳۔ اور تیسرے علوم کے اسلامیانے (Ialamization of knowledge) کی جو مہم مغرب کے اشارہ وایما پر چلائی جا رہی وہ اب اپنا رنگ لا رہی ہے، جس کے نمایاں اثرات ان اداروں کے تیار کردہ اسلامیات سے متعلق لٹریچر میں واضح طور پر ملتے ہیں۔ بطور خاص وہ دارالحرب اور دارالاسلام کے تصورات کو زمانی ومکانی پیمانوں سے ناپتے ہوئے انھیں مسترد کر رہے ہیں، اسی طرح جہاد کی نئی تعبیر کی کوشش کی جا رہی ہے ایک مرکزی خلافت اسلامیہ کے تصور کو بھی ایک کلاسیکل فقہی تصور باور کیا جا رہا ہے۔" حالانکہ مغرب ہی کے ایک پروردہ محمد اسد نے مغرب کے تعلق سے جو کچھ لکھا ہے وہ بہت حد تک مغرب کی حقیقت کو بے نقاب کر دیتا ہے۔[۱۲]

اس بارے میں اسلام اور اکیسویں صدی کا چیلنج کے مصنف کے یہ الفاظ فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں کہ "مغربی نشأۃ ثانیہ کا تصور اس جاہلیت خالصہ پر مبنی ہے جو ا۔ زمین پر انسانی زندگی کو مادہ کے ایک بڑے اور نامعلوم حادثہ کا نتیجہ سمجھتی ہے اور اسی لیے اسے کسی خالق وصانع کی ضرورت نہیں، اس کا سفر آزاد اور بلا حدود وقیود ہے، اور یہ کہ ۲۔ عقل انسانی خیر وشر اور نفع ونقصان میں تمیز کے لیے بالکل کافی، وہ عقل کلی طور پر جو خود زندگی کی اقدار متعین کر سکتی ہے۔[۱۳] موجودہ دور میں، اور اسی طرح تاریخ کے کسی عہد میں۔ عالم اسلام داخلی وخارجی دونوں طرح کے چیلنج سے نبرد آزما رہا ہے، دور نبوی سے لیکر آج تک حق وباطل کی یہ کش مکش جاری رہی ہے، آج بھی یہ صورت حال علی حالہ برقرار ہے۔ مسلم دنیا اندرونی طور پر عقیدہ اور فکری ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے، اسلامی اخلاقیات زائل ہو رہے ہیں، عبادات کا اہتمام نہیں، عقائد میں بگاڑ ہے، معاملات میں فساد برپا ہو گیا ہے، اسی طرح خارجی محاذ پر ہمیشہ ہی کی طرح دشمنان دین اپنے لاتعداد وسائل وذرائع اور مختلف انداز واسلوب میں عالم اسلام پر حملہ

آور ہیں، یہ ایسی جانی بوجھی حقیقت ہے کہ اس کا انکار کسی کے لیے ممکن نہیں، اور اسی وجہ سے انیسویں صدی کے مسلم مصلحین ومفکرین بیک وقت دونوں محاذوں پر کام کرتے رہے ہیں، بطور خاص داخلی محاذ پر زیادہ توجہ دی گئی، لیکن موجودہ دور میں ایک ٹرنڈ یہ بھی ابھرا ہے کہ خارجی چیلنجز کا سرے سے انکار کیا جانے لگا ہے اور استعمار، استشراق وغیرہ کی خوبصورت تاویلیں ڈھونڈلی گئی ہیں۔

اس سلسلہ میں الجزائری مفکر مالک بن نبی نہایت اہم ہیں، کہ انھوں نے اپنی کتاب شروط النھضۃ میں ثابت کیا ہے کہ اصل مسئلہ استعمار کا نہیں بلکہ عالم اسلام کے اندر اس کے اثرات قبول کر لینے کی کمزوری کا ہے، ان کے الفاظ میں "ليست المشكلة فى وجودالإستعمار فحسب بل فى وجودالقابلية للإستعمار"، برصغیر میں ان کے اس خیال کو مولانا وحیدالدین خاں صاحب بڑے غلو آمیز انداز میں عام کرتے رہے ہیں، اور ان کی اکثر تحریروں میں اس کی چھاپ نمایاں ہے۔ داخلی مسائل کا نہ انکار ممکن ہے، نہ ان سے صرف نظر کرنا مناسب تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ عالم اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں تقریبا تمام حادثے خارجی سازشوں کا بالواسطہ یا براہ راست نتیجہ تھے، مثلا حضرات علیؓ ومعاویہؓ کے مابین مشاجرات، مختلف زندیقی وباطنی فرقوں کا ظہور، فتنۂ تاتار، صلیبی جنگیں، خلافت ترکیہ کا سقوط (۱۹۲۳ء)، اسرائیل کا قیام (۱۹۴۱ء) عراق ایران کی جنگ، اور مابعد کی خلیجی جنگ۔

مثلا فتنۂ تاتار کا مسئلہ ہے، چھٹی دی ہجری میں پورے عالم اسلام کو شدید خارجی جھٹکا لگا، خوارزم سے لیکر بغداد، شام، عراق وایران تک ۳۰ سال کی مدت میں امت مسلمہ کے سر سے موج خون گزرتی رہی، وحشی تاتاریوں نے صحرائے گوبی سے اٹھ کر عالم اسلام کے سرسبز وزرخیز خطوں کو برباد کرنے اور ایک ایک فرد بشر کو قتل کر ڈالنے اور ایک ایک اسلامی نشان کو مٹا ڈالنے کی کوشش کی، سوال یہ ہے کہ یہ قیامت صغری اچانک اور غیر متوقع طور پر کیسے برپا ہو گئی، اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہ اس کا رخ صرف مسلمانوں کے ہی خلاف کیوں رہا، اگر چنگیز خان اور اس کے جانشین ایک کائناتی سلطنت قائم کرنا چاہتے تھے تو انھوں نے عیسائی مملکتوں کا رخ کیوں نہ کیا؟ اس فتنۂ عظیم کے سلسلہ میں مدون تاریخ جو اسباب بتاتی ہے وہ اتنے بے سروپا ہیں کہ ان کو عقل سلیم باور نہیں کر سکتی، ظاہر ہے کہ اس چنگیزی فتنہ کے پیچھے کوئی منظم اور خفیہ ہاتھ کام کر رہا تھا وہ ہاتھ کون ہو سکتا ہے، اس کا پتہ اس آیت کریمہ میں ملتا ہے "لتجدن اشدالناس عداوة للذين آمنوا اليهود والذين

اشرکوا (امائدہ) [۱۰]

اسلام اور اس کی تاریخ سے متعلق اس طرح کے بے شمار مغالطے اور غلط تجزیے مغرب نے عام کیے ہیں، جن کے اثرات نہایت دور رس ہیں، اس لیے ان کا جائزہ لینا ایک ناگزیر عمل ہے۔ بطور خاص امت مسلمہ کے لیے جو بحیثیت مجموعی ابھی دفاعی پوزیشن میں ہے، اور جسے اپنے وجود وبقا کا مسئلہ درپیش ہے، مشرق میں اس ضرورت کا احساس غالبًا تاریخ میں پہلی بار اسرار عالم نے کیا ہے، اور ان کی تحریریں دشمن کی ان خفیہ اور زیر زمین کمیں گاہوں کا پتہ دیتی ہیں جہاں سے وہ علمی وفکری یلغار کرتا ہے، راقم کے خیال میں اس عمل کو مزید آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

مراجع وحواشی

(۱) سید امیر علی اسپرٹ آف اسلام بطور خاص باب sprit the Rational & Philosphical صفحہ ۴۵۰ طبع لندن ۱۹۲۷ء احمد امین کا پورا سلسلہ اسی نظریہ پر مبنی ہے۔ فجر الاسلام، ضحی الاسلام ۳ جلد، ظہر الاسلام ۳ جلد) علامہ شبلی نے المامون کے مقدمہ میں اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔

(۲) اسرار عالم، عالم اسلام کی اخلاقی صورت حال صفحہ ۱۲۰، قاضی پبلشرز ۱۹۹۶ء

(۳) ملاحظہ ہو حدیث مشہور 'خیرالقرون قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم' لفظ خیر ہر چیز کو عام ہے۔

(۴) علامہ ابن تیمیہؒ نے المامون کے سلسلہ میں لکھا ہے "میں یہ گمان نہیں کرتا کہ اللہ تعالی مامون سے درگذر فرمائے گا لازمی ہے کہ وہ اللہ تعالی کا سامنا ان تمام باتوں کے ساتھ کرے گا جو اس نے امت میں فلسفہ کے علوم کی ترویج کر کے اس کے حق میں کانٹے بو دیئے ہیں، ان باتوں کی اسے جوابدہی کرنی ہوگی۔" شرح لامیة العجم للصفدی صفحہ ۲۸، بحوالہ اسرار عالم، عالم اسلام کی اخلاقی صورت حال، صفحہ ۱۰۰۔

(۵) اسرار عالم، اخلاقی صورت حال، صفحہ ۱۰۰ تا ۱۳۰، فصل فکری فساد، باب سوم، یہ پوری بحث اب تک کی تاریخ میں ایک نئی بحث ہے، جس سے بہت سے مسائل کی گتھی حل ہوتی ہے، اور ماضی وحال میں صحیح ربط قائم ہو جاتا ہے، فکر اسلامی میں دخیل عناصر کی نشاندہی ہوتی ہے۔ مصنف نے تاریخیت Historicism اور فلسفہ ء تاریخ (Philosphy of History) کا بھرپور طریقہ سے استعمال کیا ہے۔

(۶) پروفیسر سید محمد سلیم، مغربی زبانوں کے ماہر علماء، علی گڑھ کالج کے قیام سے پہلے، ادارہ تعلیمی تحقیق لاہور بطور خاص باب دوم، سوم، چہارم اور پنجم۔ (۷) ایضاً صفحہ ۱۰۔ (۸) ایضاً صفحہ ۱۰۔۱۱۔

(۹) مولانا سید ابوالخیر مودودی، ہندوستان کی معاشی حالت پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا اثر، بحوالہ المعارف۔

(۱۰) اسرار عالم، عالم اسلام کی اقتصادی وسیاسی صورت حال صفحہ ۴۲، ۴۳، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا۔

(بقیہ صفحہ ۴۶ پر)

ملکی سیاست اور ہندوستانی مسلمان

عبدالعزیز سلفی فلاحی چیرمین

تحریک دعوۃ القرآن ایف ۱۱/ ۲ جوگابائی اکسٹینشن نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

کسی بھی قوم کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ اس کا اعتماد اپنی قیادت سے اٹھ جائے ایسی صورت میں اس کی خود اعتمادی رخصت ہو جاتی ہے اور مکمل طور پر وہ دوسری اقوام پر انحصار کرنے لگتی ہے جب کوئی قوم اپنی زندگی کے اجتماعی فیصلے خود نہیں کرتی تو اس کی دشمن اقوام اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلہ کیا کرتی ہیں بد قسمتی سے ہندوستانی مسلمانوں کی صورت حال اس وقت ایسی ہی ہے ہندوستانی مسلمانوں کا تاریخی کردار روشن ہے وہ ایک حساس، غیور، بیدار، پرجوش اور عمل واقدام سے بھرپور کردار کے مالک ہیں آخر کیا وجہ ہے کہ گذشتہ نصف صدی کے اندر ان کا کردار بڑی حد تک ختم ہو گیا وہ ایک بے حس، بے غیرت، خوابیدہ وافسردہ قوم بن چکے ہیں، اقدام وعمل کے بجائے ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کا مصداق بن گئے ہیں۔

ہمارے کردار کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ شجاعت کے بجائے تہور، بصیرت کی جگہ ہیجان، دوررس منصوبہ بندی کے بجائے فوری نتائج کے ہم دلدادہ رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ پچاس برسوں کے درمین کوئی ایسا توقف نظر نہیں آتا جہاں اہل علم وبصیرت نے ٹھہر کر اس ملک کی اصل مشکلات، مسلمانوں کے سامنے حقیقی چیلنج اور دیگر اقوام کے لیے فطری خطرات کو سمجھنے اور اس سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کی گئی ہو ملی مسائل مین علم وتحقیق کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی، ہمارے مسائل، فرقہ وارانہ فسادات، پارلیامنٹ اور اسمبلیوں کی نمائندگی، سرکاری ملازمت، مسلم پرسنل لا، اردو زبان اور علی گڈھ مسلم یونیورسٹی، رہے ہیں ں حالانکہ یہ اصل مسائل نہ تھے اور نہ ہیں بلکہ یہ وہ نتائج اور مسائل ہیں جو سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مناسب وقت پر اچھالے اور جن سے حسب منشا نتائج حاصل کیے جاتے رہے ہیں۔ ملی قیادت، دینی وسماجی تحریکات، علما ودانشور اس پورے دورانیے میں اپنی اپنی پسند و

ترجیحات کے میدانوں میں سرگرم عمل رہے اور ملت لمحہ لمحہ زندہ درگور ہوتی رہی، مسلسل پامالیوں شکستوں اور ناہمواریوں نے اس کو مضمحل، گریزپا، مایوس وبے حوصلہ بنادیا، رہی سہی قیادت سے وہ مایوس ہوتی چلی گئی، اس کا نتیجہ یہ برامد ہوا کہ اپنی دشمن قیادت پر زیادہ سے زیادہ منحصر ہوتی گئی اس وقت وہ دوست ودشمن کی پہچان بھی گم کرچکی ہے، پوری قوم کا یہ حال ہوگیا ہے کہ :

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک کارواں کے ساتھ پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہرو کو میں

تحریک پاکستان تک مسلمان اپنی تمام کمزوریون کے باوجود اتنے کمزور وبے حوصلہ نہین تھے ان میں اپنے تئیں کچھ کر گزرنے کا جذبہ موجود تھا، عزت نفس اور قومیت کا احساس جاگزیں تھا۔ مسلمانوں میں قومی کردار اور ملی قیادت موجود تھی لیکن آزاد ہندوستان میں مسلمان تیزی سے ان خوبیوں سے محروم ہوتے چلے گئے اس کی سب سے بڑی وجہ میرے نزدیک مسلم قیادت کی تدفین ہے۔ کانگریس نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مسلم ماس کانٹیکٹ اسکیم چلائی اور بغیر سوچے سمجھے مسلمان اس کا شکار ہوگئے مسلمانوں نے متحدہ قومیت کے تصور کو قبول کرلیا اپنے نادان خیر خواہوں کے مشورے کو تسلیم کرتے ہوئے مسلمانوں نے سیکولر ریاست کے دائرے مین اپنے حقوق، تحفظات اور دیگر ملکی وسماجی حقوق کا خواب دیکھنے لگے، انھیں یہ باور کرایا گیا کہ یہی تمہاری سیاست کی معراج ہے اس سے ہٹ کر کچھ سوچنے اور کرنے کا مطلب اجتماعی خودکشی ہے۔ اس وقت تمام مسلمانوں کا سیاسی عقیدہ یہی ہے۔

موجودہ انتخابی سیاست کا بطن نصاب یہی ہے تمام چھوٹی بڑی پارٹیوں نے ماس کانٹیکٹ کی روح اور اوراس کے فلسفہ کو پوری قوت کے ساتھ پکڑ لیا ہے اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ مسلمانوں کے ووٹ کے بغیر راج سنگھاسن باقی نہیں رہ سکتا اور اگر وہ ووٹ نہ دیں تو اقتدار پر فائز نہین ہوا جا سکتا اس لیے اپنے اپنے انداز میں لبھانے اور پرچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور بات ان کے درمیان متفق علیہ یہ ہے کہ مسلمانون کے اندر کوئی قیادت ابھرنے نہ پائے۔ اس سیاسی کریکٹر کو انھوں نے تجربات سے سیکھا ہے انھیں معلوم ہے کہ مسلمان اپنی قیادت کے تحت معجزانہ اقدام کی صلاحیت رکھتے ہیں، زبردست احتجاجی ومزاحمتی صلاحیت کا مظاہرہ کرسکتے ہیں، صدیوں کی سیاسی مسافت برسوں میں طے کرسکتے ہیں، مسلمانوں کی سریع الحرکت نفسیات کا انھیں تاریخی تجربہ ہے، قومی کشمکش کی تاریخ

[illegible] پوری شدت سے وہ یاد رکھے ہوئے ہیں مگر افسوس کہ مسلمانوں نے بالکل فراموش کردیا ہے۔

اس ملک کی حکمراں قوم اپنی کمزوریوں اور تضادات سے واقف ہے اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہاں اس کے لیے اصل چیلنج اسلام اور مسلمان ہیں اس لیے نصف صدی سے وہ اس کو بے دست وپا کرنے کے لیے زندگی کے تمام میدانوں میں کہیں رازداری کے ساتھ اور کہیں نمایاں طور پر سرگرم عمل رہے ہیں، ایسے مشکل حالات میں المیہ یہ ہے کہ مسائل وحالات کو صحیح تناظر میں دیکھنے اور صحیح سمت میں رہنمائی کرنے والی قیادت موجود نہیں ہے، علماء یا تو مختلف پارٹیوں میں چوبداری کے فرائض انجام دے رہے ہیں یا مایوس ہوکر مدارس ومساجد میں دینی فرائض انجام دے رہے ہیں قضا وافتاء اور پرسنل لا کا تحفظ یہی ان کی جدوجہد کا آخری ہدف ہے، سیاسی وسماجی مسائل اور زندگی کے اہم اور وسیع تر میدانوں سے انکا کوئی سرگرم رابطہ باقی نہیں رہا ہے، اگر کچھ تعلق ہے تو صرف سیکولر پارٹیوں اور لیڈروں کے حق میں اپیلیں نشر کردینا اور بس، باقی جو ہیں وہ یا تو سیاسی بازیگر ہیں جو ہر انتخاب کے موقع پر شعبدہ دکھانے میں مصروف ہوجاتے اور کچھ گھٹیا قسم کے مفادات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا پھر بے مغز دانشور ہیں جو مختلف سیاسی پارٹیوں کی انتخابی مہم کا حصہ بن کر اپنا کمیشن بنانے کی فکر میں ایک الیکشن سے دوسرے الیکشن تک اپنی ذہانت ودانشوری کے تجربات میں مصروف رہتے ہیں۔

اس وقت مکمل سیاست کے افق پر کانگریس اور بی جے پی دو ایسی علامتوں کی صورت میں چھائی ہوئی ہیں جو اپنے اہداف یعنی اقتدار پر مکمل دسترس اور اپنی پالیسیوں اور ترجیحات کے مطابق اس ملک کی حکمرانی کا خواب دیکھ رہی ہیں۔ ان میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے، دونوں کی قومیت ذہنیت، عزائم اور تصورات یکساں ہیں فرق صرف طریق کار کا ہے کانگریس کی حکمت عملی لطیف غیر نمایاں، تدریجی اور جمہوریت کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے جبکہ بی جے پی آر ایس ایس کا سیاسی مظہر ہے اس کا طریق کار غیر شائستہ، واضح، انقلابی اور فسطائیت کی علامت ہے۔

کانگریس کا فلسفہ یہ رہا ہے کہ اپنے منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے حالات اور ماحول کو اس طرح ڈھالا جائے کہ لوگ مزاحمت کے بجائے رضاکارانہ اور خود اختیاری جذبہ کے ساتھ وہ اس کو قبول کرلیں جبکہ بی جے پی زور زبردستی، سیاسی قوت، حکومتی جبر اور دستوری تبدیلیوں کے ذریعے اپنے مقاصد کی تکمیل چاہتی ہے اس کی سب سے نمایاں مثال دہلی ٹائمز میں ۱۶ر دسمبر ۹۸ء ارن

کمار داس کی وہ انٹرویو رپورٹ ہے جو دہلی کے کانگریسی وزیر تعلیم ڈاکٹر نریندر ناتھ نے تعلیمی پالیسی اور کانگریس کی ترجیحات کے ضمن میں اپنابیان ریکارڈ کرایا ہے۔

....."Thohgh there nothing wrong in introducing Yoga,we have to approach issue cautiously."

اگرچہ یوگا کو متعارف کرانے میں کوئی برائی نہیں ہے پھر بھی ہم اس معاملے کو احتیاط سے نمٹانے کی کوشش کریں گے۔

سرسوتی وندنا کے بارے میں کانگریسی وزیر تعلیم کا ارشاد ہے۔

"If a student voluntarily wants to recite ti ,we do not have any problem. But apart from discipline the government wiil not impose any thing on students or teachrs."

" اگر ایک طالب علم رضاکارانہ طور پر چاہتا ہے کہ اس کو پڑھے تو ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہے لیکن ڈسپلن کے ایک جز کے طور پر حکومت کوئی چیز طلبہ یا اساتذہ پر نہیں تھوپے گی۔"

وزیر موصوف اور تمام سیکولر اور کانگریسی لیڈروں سے یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ ایسی تعلیم گاہوں میں جہاں مختلف مذاہب، تہذیبوں اور نظریات کے ماننے والوں کے بچے تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جاتے ہیں انھیں یوگا سے متعارف کرانے کی ضرورت کیا ہے؟ سیکولرزم کی یہ کونسی قسم ہے کہ مختلف مذاہب کے بچوں کو سرکاری اسکولوں میں بلاکر ہندومت کی تعلیم دی جائے اور انھیں تہذیبی اعتبار سے مرتد بنانے کی کوشش کی جائے لیکن جب کوئی بالغ ہندو اسلام یا عیسائیت قبول کر لیتا ہے تو یہی بہت برائی ہو جاتی ہے یہی منطق جنون کی شکل اختیار کر کے معصوم بچوں کو زندہ جلانے لگتی ہے۔ یہ الفاظ غور طلب ہیں کہ اگر کوئی طالب علم رضاکارانہ طور پر اپنی پسند سے وندے ماترم پڑھے یا سرسوتی کی پوجا کرے تو ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہے لیکن ڈسپلن کے ایک حصے کے طور پر ہم طلبہ و اساتذہ پر کوئی چیز نہیں تھوپیں گے۔

کیا ایک کم سن اور معصوم بچہ اپنے طور پر اپنی رضاکارانہ پسند کا اظہار کر سکتا ہے اور اس کا یہ عمل معتبر کہلا سکتا ہے سچ یہ ہے ہرش وردھن جو چیز قانون و ڈسپلن کے جبر کے ساتھ کرنا چاہتے تھے وہی کام نریندر ناتھ ماحولیاتی اور سماجی جبر کے ساتھ لینا چاہتے ہیں سیکولرزم اور فسطائیت کے درمیان بس اتنا ہی فرق ہے اور ایک احمق ہی ان کے بارے میں ردو قبول کا فیصلہ کر سکتا ہے۔

ہرش وردھن بی جے پی دور حکومت میں دہلی کے وزیر تعلیم تھے موصوف نے کرشن گوپال رستوگی کی سربراہی میں ایک کمیٹی تشکیل دی تھی جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہندتو کے عزائم کے مطابق بنیادی تعلیم، درجہ ایک سے پانچ تک، کے بطن نصاب میں لازمی تبدیلی کی سفارشات پیش کرے اس میں یوگا، سرسوتی پوجا، وندے ماترم اور آرین کلچر کے مطابق بنیادی تعلیم کے نظام و نصاب کو ڈھالنا تھا۔ مسٹر رستوگی نے موجودہ بطن نصاب میں تبدیلی کی تجاویز پر مشتمل رپورٹ وزارت تعلیم کو پیش کر دی تھی لیکن کوئی فیصلہ ہونے سے پہلے سیاسی انقلاب آگیا کانگریسی وزیر تعلیم نے رستوگی کمیٹی کی رپورٹ کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد کوئی فیصلہ کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن اب تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ نئی وزارت کی تعلیمی ترجیحات کیا ہیں؟

مسٹر نریندر ناتھ نے اس وقت کوئی فوری تبدیلی کو مسترد کرتے ہوئے یوگا اور سرسوتی پوجا کے سلسلے میں جو الفاظ ادا کیے تھے اس کے بین السطور سے بہت کچھ واضح ہے وہ مزید کسی تجزیہ و تفہیم کے محتاج نہیں ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ حکمراں گروہ سے مسلمانوں، عیسائیوں اور دیگر مذاہب کے پیرواں کا جو اصولی اور بنیادی اختلاف ہے اس میں کانگریس اور آر ایس ایس کا کوئی اختلاف نہیں ہے اور تاریخ میں کبھی نہیں تھا۔ کانگریس نے آر ایس ایس کو جنم دیا ہے، یہ کانگریس ہی ہے جو چالیس برس تک مسلمانوں کے ووٹوں سے حکومت کرتی رہی اور اس نے مسلمانوں کو اس حال تک پہنچایا ہے، یہ کانگریس ہی تھی جس نے بابری مسجد کی تالابندی کی، یہ کانگریس ہی تھی جس نے تالا کھول کر ہندوؤں کے حوالہ کیا اور مسلمانوں پر اس کے قریب پھٹکنے تک پر پابندی عائد کر دی، سونیا گاندھی کے آنجہانی شوہر راجیو گاندھی تھے جنھوں نے رام مندر کا بھگت بن کر شیلانیاس کرایا یہ کانگریس ہی کا عہد زریں تھا جب دن دہاڑے مسجد ڈھادی گئی۔ اڈوانی، اما بھارتی، اشوک سنگھل اور کلیان سنگھ اپنے غنڈوں کی قیادت کر رہے تھے اور کانگریسی وزیر اعظم ٹیلی ویژن پر انہدامی کارروائیوں کو دیکھتا اور محظوظ ہوتا رہا۔ یوپی میں صدارتی راج نافذ کرنے کے بعد مرکزی حکومت نے اپنی نگرانی میں انھیں غنڈوں کے ہاتھوں رام للا چبوترہ تعمیر کراتی رہی اور پھر پورے سرکاری اعزاز اور ملٹری تحفظات کے ساتھ اسپیشل ٹرینوں کے ذریعہ ان غنڈوں کو ان کے مقامات تک پہنچایا گیا اور مسلمان جب اپنے غم و غصہ کا اظہار کرنے کے لیے دنیا کی سب سے بڑی جمہوری مملکت میں سڑکوں پر آئے تو پولس اپنے سرکاری فرائض انجام دینے کے لیے

مستعد تھی۔

یہ کانگریس ہی کا دور حکومت تھا جس میں لکھوکھا مسلمانوں کا خون بہا مگر آج تک کوئی قاتل پکڑا نہیں گیا یہ کانگریس کا ہی نصیبہ تھا کہ مسلمانوں سے الیکشنی فنڈ بھی لیتی رہی اور انھیں معاشی اعتبار سے پامال بھی کرتی گئی، جن ہاتھوں سے ووٹ لیتی رہی انھیں کے سر قلم کرتی رہی۔ یہ کانگریسی سیکولرزم تھا جس کے تحت درجنوں بار پرسنل لا پر حملہ ہوا، یہ کانگریس بہادر ہی کی اعلی ظرفی تھی کہ مذہبی اور تعلیمی آزادی کا راگ بھی الاپا اور مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار بھی دبایا اور اختیاری سول کوڈ کے لیے حالات کو سازگار بھی بنایا، یہ کانگریس کی نوازش تھی کہ کوٹھاری کمیشن کے ذریعہ غریب مسلمانوں کے مکتبی نظام تعلیم کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی اور صبح آزادی کے ساتھ ہی اردو زبان وتہذیب کو جلاوطن کر دیا اس پر بھی دیش کے مہاپرشوں اور بھارتی سیکولرزم کے علمبرداروں کو جب قرار نہ آیا تو بھارت کی تقسیم کا ذمہ دار، ملک سے بے وفائی وغداری کا الزام، مین اسٹریم سے علیحدگی کی فرد جرم عائد کر دی گئی اس طرح مسلم نوجوانوں کو دہشت گرد، مدارس کو ISI کا اڈہ اور مسلم بستیوں کو جنگجو قرار دے کر سیاسی وسماجی اعتبار سے پوری ملت کو یرغمال بنالیا RSS کے عزائم اور منصوبے اس کے سوا اور کیا ہیں؟

فاشزم کے مقابلے مین سیکولرزم ایک بودا اور لچر نظریہ ہے عام حالات میں سیکولرزم کے فلسفہ میں کشش ہو سکتی ہے لیکن انقلابی موڑ پر سیکولرزم کا نفاق پورے طور پر نمایاں ہو جاتا ہے۔ سیکولر قوتوں کا موجودہ بکھراو اور فاشزم کا دن بدن طاقتور سیاسی چیلنج کی حیثیت سے ابھرنا اس کا فطری نتیجہ ہے ۔بابری مسجد کے انہدام کے بعد ملی سیاست اور اس کے مستقبل پر تبصرہ کرتے ہوئے راقم الحروف نے یہ لکھا تھا،

سیکولرزم ایک نفاق آمیز سیاسی نظریہ ہے جس کی مستقل کوئی بنیاد نہیں ہے، نہ اس کی کوئی متعین آئیڈیالوجی ہے اس کے مقابلے میں فاشزم احیائی سیاست کا ایک طاقتور تخیل ہے اور اب سیاسی قوت بن کر سیکولرزم کے لیے ناقابل تسخیر بن چکا ہے۔ قانون فطرت کے مطابق طاقتور کمزور کو مرعوب ومتاثر کرتا ہے۔ اس وقت سیکولر پارٹیوں میں ایک بڑی تعداد فکری اعتبار سے فاشزم کی ہم نوا ہے اس پہلو سے کانگریس سب سے زیادہ فرسودگی کا شکار ہے۔ وہ وقت قریب ہے جب موقع پرست سیکولر عناصر سیکولرزم کا لبادہ اتار کر فاشزم کے دست وبازو بن جائیں گے اور آر ایس ایس اپنے دیرینہ خوابوں کی بے

تعمیر تلاش کریگی اس وقت مطلع سیاست اتنا صاف اور واضح نہیں تھا لیکن اس وقت ایک اندھا [illegible] کہہ رہا ہے اور تیز رفتار تبدیلیوں کے آثار بہت نمایاں ہیں۔

گذشتہ سال بی جے پی جب اقتدار میں آئی تو عارضی مصلحتوں کے تحت اس کو اپنے سیاسی نظریہ اور پالیسیز میں ایسی تبدیلی الفاظ یا نرمی پیدا کرنی پڑی تا کہ متنوع افراد اور پارٹیوں کی مطلوبہ پارلمانی حمایت حاصل کی جاسکے اور اقتدار کا حصول ممکن ہو واضح رہے کی بی جے پی نے آرٹیکل ۳۷۰ کا خاتمہ جو ریاست کشمیر کو ایک مخصوص دستوری حیثیت دیتا ہے، یکساں سول کاڈ کا نفاذ اور بابری مسجد کی جگہ رام مندر کی تعمیر کو اپنے انتخابی منشور میں خاص طور پر نمایاں کیا تھا لیکن اتحادی پارٹیوں کو یہ نکات پسند نہیں تھے اس لیے اتحادی حکومت کی ترجیحات سے یہ تینوں نکات خارج کر دیے گئے تھے۔ تیرہویں لوک سبھا کے انتخابات میں واضح اور یقینی کامیابی کے لیے بی جے پی کے پالیسی ساز دماغوں نے الیکشن سے پہلے سیاسی حلیف اور فکری اتحاد پیدا کرنے کی ضرورت محسوس کی چنانچہ نگراں حکومت میں شریک اتحادیوں کے علاوہ بعض دوسری علاقائی پارٹیوں کے اشتراک سے این ڈی اے (National Democrat-ic Alliance) کی تشکیل کی گئی، بی جے پی نے اپنا مینی فسٹو لانے کے بجائے این ڈی اے کی طرف سے منی فسٹو جاری کیا جس میں فطری طور پر ان نکات کا تذکرہ نہیں ہے سوال یہ ہے کہ کیا بی جے پی نے اپنے نظریہ سیاست کی اصلاح کر لی ہے یا سیاسی مصلحتوں کے پیچھے اپنے پروردہ مسائل کو چھپا رکھا ہے۔ سازگار ماحول پاتے ہی فاشزم کا درندہ اپنے خول سے باہر آجائے گا۔ یہ ایک سوال ہے جس سے بی جے پی کی مادر مہربان کو بھی تشویش لاحق ہے۔ قومی سیاست میں بھی مختلف زاویوں سے اظہار خیال کیا جارہا ہے اور ہمارے مسلم دانشور اور لال بجھکو قسم کے لوگ بھی اس پر رائے زنی کر رہے ہیں۔ اس لیے یہ صورت حال تنقیح طلب ہو گئی ہے۔ بھارتی جنتا پارٹی کے جنرل سکریٹری Ideologue مسٹر کے این گوند اچاریہ کے الفاظ اس سلسلے میں یہ ہیں:

We work with a bifocal vision .We are neither breaking out of our commitment to those issues nor are we apologet about our stand. (TOI ND Aug. 25, 1999)

ہم قریبی اور دوررس مقاصد کے پیش نظر کام کرتے ہیں، ہم نے ان تینوں مسائل یعنی دفعہ ۳۷۰، یکساں سول کوڈ اور رام مندر کی تعمیر، سے ناطہ توڑا ہے تعلق ہوئے ہیں اور نہ اپنے موقف کے سلسلے

میں معذرت خواہ ہیں۔

غور فرمایئے قریبی مقصد حصول اقتدار ہے اور اس کے ذریعہ وہ قوت حاصل کرنا ہے جس سے دوررس مقاصد کی تکمیل ہو سکے۔ مسٹر آچاریہ آگے بغیر کسی تامل کے واضح لفظوں میں اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں۔

Vith the BJP yet to traverse some more distance to attain the teering position in Indian Politics ,we decided that in this in-er-regnom of transition we should commit ourselves to the locument of the national agenda for governance formulated n the basis of consensus among all the partner of NDA.(do)

ہندستانی سیاست میں بی جے پی کو اسٹیرنگ پوزیشن حاصل کرنے میں ابھی مزید کچھ مسافت طے کرنا باقی ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ انتقال اقتدار کے اس سیاسی خلا کے دورانیے میں ہم کو اپنے تئیں حکومت کرنے کے لیے قومی ایجنڈے کی دستاویز کو تسلیم کرنا ہوگا جو NDA میں شریک تمام پارٹیوں کے اتفاق رائے سے تشکیل دی گئی ہے۔

اس سیاق میں ایک اور پیراگراف بہت اہم ہے جس پر نظر ڈالنا مناسب رہے گا گوند اچار اپنے اسی انٹرویو میں کہتے ہیں:

Nobody doubted the prty's commitment to the three issues but our approach is perfectly in tune with national iterest ,social iterest and economic prosperity.(do)

ان تینوں مسائل میں پارٹی کمٹمنٹ میں کسی شخص کو شبہ نہیں ہے لیکن ہمارا موجودہ طرز عمل قومی سماجی مفادات اور معاشی بہبود کے عین مطابق ہے۔

ٹائمز آف انڈیا نے ۲۵ر اگست ۹۹ء کی اشاعت میں بھارتی جنتا پارٹی کے اہم لیڈروں کے بیانات اور احساسات کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔ یوپی میں آر ایس ایس کے ایک اہم ستون اور پبلک ورک ڈپارٹمنٹ کے وزیر کلراج مشرا کہتے ہیں،

His party had not dropped the temple issue.'Election or no election',the party is commited to its constitution "headed.While admitting that for the time being the party had to drop the matter because it was not acceptible to some of the coalition parties.The BJP head said as soon as all of them were convinced

the constitution of the temple would be started. (TOI ND Aug 1999)

نے کہا کہ ان کی پارٹی نے مندر مسئلہ کو ترک نہیں کیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ الیکشن ہو یا نہ ہو مندر کی تعمیر کی پابند ہے ایک دوسرے سوال کے جواب مسٹراجی کے الفاظ تھے،

The temple was very much on the pary's agenda یعنی مندر تو پارٹی کا اہم ایجنڈا ہے۔ جبکہ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ عارضی طور پر پارٹی نے اس مسئلہ کو ترک کر دیا ہے یہ حکومتی اتحاد میں شریک بعض لوگوں کو گوارا نہ تھا، بی جے پی لیڈر نے کہا جس قدر جلد وہ تمام ہم نوا ہوں گے مندر کی تعمیر شروع کر دی جائے گی۔

بی جے پی کے نائب صدر فرماتے ہیں:

It is obvious that asection of the BJP ,partivularly the one whe belonging to the Sangh Parivar ,does not want the issue of Ram temple .Article 370 and a common civil code to be side lined since this could cost the party its commited vote bank and also prove determined to its identity .(TOI ND Aug,25,1999)

بات بہت واضح ہے کہ بھارتی جنتا پارٹی کا ایک طبقہ خاص طور پر وہ جو سنگھ پریوار سے تعلق رکھتا ہے، وہ الکل نہیں جانتا کہ رام مندر، دفعہ ۳۷۰ اور یکساں عائلی قانون کو پرے رکھ دیا جائے جبکہ اس سے پارٹی کے مضبوط ووٹ بینک کا زیاں بھی ہو سکتا ہے اور اس کی شناخت کو نقصان پہونچ سکتا ہے۔

مسٹر ماتھر کہتے ہیں: These are the principles to which the party is com-mited but there is always a difference between principles and practice.Mr.Mathur stressed ."The Ram temple is already there.Now it is only a question of constitution an even bigger and bharya (magnificent) tmple.(do)

تو وہ اصول ہیں (تینوں مسائل) جن کے تئیں پارٹی پابند ہے لیکن اصولوں اور عمل میں بہت فرق ہوا کرتا ہے، مسٹر ماتھر نے زور دے کر کہا کہ رام مندر تو پہلے ہی وہاں موجود ہے اب تو سوال صرف ایک یم اور متاثر کن مندر کی تعمیر کا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

In New Delhi ,BJP spokesman Arun Jaitly said the party waas still commited to certain issues,including abrogation of Article 370 but was not insisting on them as the BJP was part of the

N.D.A.(do)

نئی دہلی میں بی جے پی ترجمان ارن جیٹلی نے کہا کہ متعین مخصوص مسائل کی پارٹی اب بھی پابند ہے ۔ شمول دفعہ ۳۷۰ کے خاتمہ کے ، لیکن پارٹی ان پر اصرار اس لیے نہیں کر رہی کہ بھارتی جنتا پارٹی قومی جمہوری اتحاد کا حصہ ہے۔

ان ضروری اقتباسات کا حوالہ میں نے اس لیے دیا ہے تا کہ یہ دستاویزی بیانات ذہنوں میں محفوظ رہیں اور بی جے پی اور آر ایس ایس کے چہروں پر عارضی نقاب اور مصلحت کے پردوں کو دیکھ کر لوگ دھوکہ نہ کھائیں اور ان کے اصل ارادے واضح ہو سکیں شیخ سعدی نے کیا خوب کہا ہے ؎

گرگ زادہ گرگ شود　　گرچہ آدمی بزرگ شود۔

بھیڑیئے کا بچہ بھیڑیا ہی ہوگا اگر چہ اس نے آدمی کی صحبت میں رہ کر بزرگی و شرافت کے اطوار سیکھ لیے ہوں ، بی جے پی کے فکر و عمل کی اس سے اچھی تعبیر غالباً ممکن نہیں ہے ۔ اب ان بیانات کا تجزیہ کر کے دیکھنا چاہیے کہ آر ایس ایس اور اس کے حکمراں نمائندے کیا چاہتے ہیں اور اس ملک کو کہاں لے جانا چاہتے ہیں۔

گوند اچاریہ کے خیالات اس لحظ سے بہت اہم ہیں کہ وہ آر ایس ایس کے نفس ناطقہ ہیں ، اس کی سوچ اور ترجیحات کی نمائندگی کرتے ہیں ۔ ان کے خیال میں ملکی سیاست میں آر ایس ایس کو مکمل غلبہ اور بلاشرکت غیرے حکومت واقتدار حاصل کر لینے میں ابھی کچھ وقت انتظار کرنا ہوگا اور جب تک ان کے ہاتھوں میں کامل اقتدار نہیں آجاتا کچھ کم عقل اور ہوس اقتدار رکھنے والے افراد اور گروپوں سے سیاسی تال میل کے ذریعہ حکومت سازی ناگزیر مرحلہ ہے تاکہ اس فائنل گول کو حاصل کیا جا سکے اور فریق غالب کی حیثیت سے اقتدار میں رہنا از بس ضروری ہے۔

مسٹر آچاریہ نے اپنے موجودہ اجتماعی رویہ کی توجیہ کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت دور و نزدیک کے اہداف بیک وقت پیش نظر ہیں ، ہم اپنے آخری اہداف کی طرف بڑھ رہے ہیں لیکن فوری اور قریبی مفادات کو بھی تج نہیں سکتے ، اقتدار کے مفادات حاصلہ کے ساتھ نظریاتی و سیاسی فتح مندی کے لیے کوشاں ہیں ، اس روش پر چلتے ہوئے نہ ہم نے اپنے نظریات سیاست کو ترک کیا ہے اور نہ ہم نے اپنے موقف اور اصولوں پر کسی کے سامنے شرمندہ و معذرت خواہ ہوتے ہیں۔

رام مندر کی تعمیر ، یکساں سول کوڈ اور دفعہ ۳۷۰ کے خاتمہ پر کوئی نظریاتی مصالحت ممکن نہیں ہے ، ان تمام مسائل میں پارٹی اپنے عہد اور عزم پر قائم ہے البتہ عملی راہ جو نکالی گئی ہے یہی راہ عمل ملکی مفاد میں ہے ، سماج کا بھلا بھی اسی میں ہے اور ملک کی معاشی بہبود کا تقاضا بھی یہی ہے یعنی فی الحال ایسے راست اقدام سے پرہیز کیا جائے جس سے کوئی بڑا ہنگامہ رونما ہو ، بالواسطہ اور تدریجی طور پر اپنے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

گوند اچاریہ کے اس بیان نے سب سے زیادہ سنگھی کنبے کو متاثر کیا ہے چنانچہ مختلف سطحوں سے اس کی وضاحت ، معنویت اور اس کی تاویل و توجیہ میں آر ایس ایس کے دانشوروں نے جو باتیں کہی ہیں وہ بہت اہم ہیں ذرا ان پر بھی غور و فکر کر لیں ، یوپی کیبنٹ میں آر ایس ایس کی فکر و ترجیحات کے نمائندے کلراج مشرا کہتے ہیں کہ پارٹی نے مندر مسئلہ کو ترک نہیں کیا ہے یہ تو اس کا اہم ترین ایجنڈا ہے ، الیکشن کا زمانہ ہو یا عام حالات ہوں پارٹی مندر کی تعمیر کی پابند ہے۔ مشرا جی نے خاص بات یہ کہی کہ عارضی طور پر پارٹی نے اس مسئلہ کو مؤخر کیا ہے اور یہ اس کی مجبوری تھی کیوں کہ اتحاد میں شریک بعض پارٹیوں کو اس سے اتفاق نہیں تھا ، اتحادی پارٹیاں جیوں ہی آر ایس ایس کے موقف کو تسلیم کریں گی مندر کی تعمیر کا آغاز ہو جائے گا۔ اس سے تین اہم نتیجے برآمد ہوتے ہیں۔

(۱) بی جے پی عارضی طور پر مندر مسئلہ کو التوا میں ڈالا ہے ، اپنے موقف سے دست بردار نہیں ہوئی ہے نہ اس میں کوئی اصلاح قبول کی ہے بلکہ سیاسی مفادات کے پیش نظر وقتی طور پر اپنی ترجیحات میں اس کو پیچھے رکھا ہے۔

(۲) اتحاد میں شریک جماعتوں میں سے صرف بعض پارٹیوں نے اس کے خلاف سخت موقف اپنایا ہے اکثریت اس کی ہم نوا یا خاموش حمایتی ہیں ، اکثریت کو کوئی اہم اور اصولی اختلاف نہیں ہے۔

(۳) آر ایس ایس اور بی جے پی اتحادی جماعتوں کو اپنے موقف پر راضی کرنے اور انھیں ہموار بنانے کی کوششوں میں مصروف ہیں اور اس کوشش کے سلسلے میں انھیں اعتماد ہے کہ وہ بھی جلد حمایت پر آمادہ ہو جائیں گے۔

اس سیاق میں سب سے زیادہ اہم بات مشرا جی نے یہ کہی ہے کہ اتحادی جماعتوں کی حمایت

حاصل ہوتے ہی مندر کی تعمیر شروع کر دی جائے گی اس متنازعہ مسئلہ میں جو عدالت عالیہ میں زیر سماعت ہے، اس امر کا فیصلہ ہونے سے پہلے کہ دعویداروں میں استحقاق کس کا ہے اور کس نے غاصبانہ طور پر قبضہ کیا ہے، اس ناجائز قبضہ کو سیاسی جبر کے ذریعہ قطعی اور حتمی بنانے کا عزم کر لیا گیا ہے، قانون، انصاف، عدل و میزان کی آر ایس ایس کی نظر میں پر کاہ کے برابر بھی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ حق و انصاف وہی ہے آر ایس ایس جو فرما دے اور اس کو تسلیم کرنے میں جس کو تامل ہو وہ اس ملک کا باغی، وطن دشمن اور ملکی سلامتی کے لیے ایک خطرہ ہے جس کو حکومت و اقتدار کی طاقت سے مٹا دینا ملکی اتحاد، قومی یکجہتی اور قابل فخر ہندوستان کی تعمیر کے لیے ضروری ہے۔

جے پی ماتھر جو بی جے پی کے نائب صدر ہیں وہ فرماتے ہیں کہ بھارتی جنتا پارٹی کا Cover گروپ جو آر ایس ایس سے تعلق رکھتا ہے وہ ہرگز یہ پسند نہیں کرتا کہ رام مندر کی تعمیر، دفعہ ۳۷۰ اور یونیفارم سول کوڈ جیسے اہم نظریاتی مسائل کو نظر انداز کر کے عملی سیاست کے تقاضوں کو پورا کیا جائے اگر ایسا کیا گیا تو پارٹی کا مستحکم ووٹ بینک ٹوٹ سکتا ہے اور پارٹی کی شناخت کو واضح طور پر نقصان پہنچے گا۔

مسٹر ماتھر نظریاتی وفاداری اور عملی رویہ پر ایک جملے میں بڑا معنی خیز تبصرہ کیا ہے، کہتے ہیں کہ ان تینوں اہم مسائل پر جماعت کی وفاداری کسی بھی شبہ سے بالاتر ہے لیکن اصول و عمل میں ہمیشہ فرق ہوتا ہے۔ موصوف نے آر ایس ایس کی تشویش کو بین السطور میں رفع کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے درمیان ہندتو کے نظریہ ء سیاست پر کوئی اختلاف نہیں ہے اس کے تئیں ہماری وفاداریوں میں کوئی کمی پیدا نہیں ہوئی ہے یہ جو کچھ بظاہر نظر آرہا ہے وہ وفا و اخلاص کا بحران نہیں ہے بلکہ اصول و عمل کے درمیان تطبیق کا فطری نتیجہ ہے، اتنی وسعت و گنجائش رکھنی چاہیے اور اتنا تو گوارا کرنا ہی پڑے گا۔ مسٹر ماتھر زیر لب انبساط اور ڈھٹائی کے ساتھ اپنے متبعین کے شرح صدر کے لیے رعونت بھرے لہجہ میں فرماتے ہیں رام مندر تو پہلے ہی وہاں موجود ہے، مندر کے وجود و عدم وجود کا مسئلہ سرے سے ہے ہی نہیں بلکہ اس موجود مندر کو ایک عظیم الشان اور مرعوب کن مندر میں تبدیل کرنے کا مرحلہ باقی رہ گیا ہے۔ حالات سازگار ہوتے ہی، جس کے لیے زیادہ انتظار کی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی، یہ آرزو اور دیرینہ تمنا بھی پوری کر دی جائے گی۔

پارٹی ترجمان ارن جیٹلی نے کہا کہ پارٹی تمام بنیادی اشوز پر قائم اور پابند و کاربند ہے لیکن

موجودہ حالات میں ان پر اصرار اس لیے نہیں کیا جا رہا ہے کہ بھارتی جنتا پارٹی این ڈی اے کا حصہ ہے۔ اگر اس مرحلہ میں پارٹی اشوز پر اصرار کیا جائے گا تو مفادات حاصلہ اور پیش نظر اہداف کو غیر معمولی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے مصلحت اور ڈپلومیسی کا تقاضا یہی ہے کہ سیاسی جڑیں مضبوط اور گہری ہونے سے قبل کچھ ناگواریوں کو گوارا کیا جائے ورنہ اپنے عقیدے کے مطابق بھارت کی تعمیر نہیں ہو سکے گی۔ اسی لیے اے بی واجپائی نے کہا کہ متذکرہ مسائل الیکشنی مہم کا حصہ نہیں ہیں اسی کے ساتھ گونداچاریہ کے بیان پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ان مسائل کو بی جے پی کا ایجنڈہ ہونے سے انکار نہیں کیا اور نہ آچاریہ کے خیالات کی نفی کی، حیرت اس بات پر ہے کہ آخر اس موقع پر اس کو کیوں چھیڑ دیا گیا جبکہ یہ اس کا موقع نہیں تھا۔ مسٹر اڈوانی نے کہا کہ پانچ برس تک یہ مسائل نہیں اٹھائے جائیں گے۔ آر ایس ایس نے اپنے رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پہلے اقتدار پھر ہندتو کے مسائل و ترجیحات۔ ان بیانات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ منصوبے اور عزائم کیا ہیں، اس پر مزید کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ مسلم دانشوران مسائل کے سلسلے میں کیا سوچتے ہیں اور اس اہم موڑ پر ان بنیادی امور کو وہ کس زاویہء نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مسلم دانشوروں کی فہرست بہت طویل ہے ہم نمونے کے طور پر ان میں سے چند کے افکار و تصورات کا جائزہ لیں گے۔ ان میں ایک معروف نام خواجہ افتخار احمد صدر کل ہند مسلم مجلس شوری کا ہے، اس نام کی اہمیت یہ ہے کہ ہندتو کے عروج کے ساتھ ہی یہ نام معروف ہوا ہے پچھلے چند لوک سبھائی انتخابات کے دوران اخبارات میں کافی نمایاں ہوا ہے اور مسلم مسائل اور ہندوستانی سیاست پر کافی کچھ موصوف لکھتے اور اپنے نظریات پیش کرتے رہے ہیں "مستقبل کا ہندستان۔ ایک فکری بحث" جیسے اہم موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے خواجہ صاحب رقم طراز ہیں؛

.... لیکن اس بات کی ضمانت کون دیگا کہ جمہوریت میں عوام کا انتخاب ہمیشہ گاندھی اور نہرو ہی ہوں گے، اس میں گول والکر اور رجو بھیا، ونے کٹیار، اشوک سنگھل اور بال ٹھاکرے نہیں ہوں گے۔ آر ایس ایس یا دوسرے ایسے نظریات رکھنے والے لوگوں کو کبھی موقع نہیں ملے گا، یہ بات اس وقت سوچنے کی تھی اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ تو ہونا ہی تھا اور ہو گیا اور آگے بھی ہو سکتا ہے۔ اس

کے چلتے اپنے تشخص کی بقا کے لیے ان لوگوں سے اور ان کے نظریات سے ٹکرانا لائحہ ء عمل ہے، ان کو یکسر انکار دینا حکمت عملی ہے یا اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے مسلمانان ہند کے تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے موقف کی حقانیت منوانے اور ان حضرات کے موقف میں اعتدال پسندی اور انصاف پسندی کے عنصر لانے کے لیے مذاکرات کے عمل کو شروع کرنے کی ضرورت ہے، ضد، ہٹ دھرمی، منفی طرز فکر ہی اس مسئلہ کا حل ہے اور نہ ہی براہ راست یا بالواسطہ تصادم" (ماہنامہ ستون نئی دہلی ستمبر ۹۸ء ص ۳۹)

حیرت ہے خواجہ صاحب اتنے اہم موضوع پر اظہار خیال کر رہے ہیں اور انھیں اس بحث کے بنیادی مقدمات تک کی خبر نہیں ہے، اندازہ کیجیے کس قدر سرسری اور جذباتی انداز میں اظہار رائے فرمایا جارہا ہے۔ ان کی سادہ لوحی کا یہ حال ہے کہ جن کی فکر سیاست کا سرچشمہ Beauty of thoughts ہو ان سے اپنے موقف کی حقانیت منوانے اور مسلمانوں کو بہ حیثیت ملت مٹا دینا جن کا نصب العین ہو ان سے ان کے موقف میں مسلم تشخص کے تئیں اعتدال و انصاف پسندی کا عنصر لانے کے لیے پر امید ہیں اور خواجہ صاحب کے جذبہ انصاف اور نکتہ رسی کی داد دیے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ موجودہ سیاسی کشمکش میں ضد، ہٹ دھرمی، منفی طرز فکر اور براہ راست یا بالواسطہ تصادم کو موصوف نے مسلمانوں کے پلڑے میں ڈال دیا ہے۔ ایک قاری بجا طور پر خواجہ صاحب کے بارے میں مختلف شکوک میں مبتلا ہو سکتا ہے لیکن میں حسن ظن کو باقی رکھتے ہوئے خواجہ صاحب سے یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ آپ نے غیر شعوری طور پر ٹھیک ہندتو کی منطق اپنائی ہے۔ اور اپنے منہ میں آر ایس ایس کی زبان لے کر کلام فرما رہے ہیں۔ بات اگر صرف اتنی ہوتی تو شاید ہوش اصلاح کا نتیجہ قرار دے کر نظر انداز کر دیا جاتا۔ اس مضمون کے مندرجات افسوس ہے کہ خواجہ صاحب کے بارے میں حسن ظن کا کوئی معیار بھی باقی نہیں رکھتے۔ ملاحظہ کیجیے آچاریہ کے خیالات کس طرح خواجہ کے اسلوب میں ڈھل گئے ہیں، بلکہ آچاریہ کے نام اور اسلوب میں فطری طور پر وہ کشش نہیں ہو سکتی تھی جو خواجہ اور ان کے طرز کلام کا اعجاز ہو سکتی ہے:

"البتہ لازمی ہے کہ غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کے لیے اصولی طور پر ایک فکری بحث قومی و ملی دونوں سطح پر چھیڑی جائے جس میں ہمیں یہ تسلیم کرتے ہوئے آگے بڑھنے کی ضرورت ہے کہ اکثریت

اگر اپنے عقائد اور قدیم روایات کے تحت ملک کے نظام کو چلانا چاہتی ہے، اس فکر کی بالادستی چاہتی ہے تو اسے اس کا پورا حق حاصل ہے اس میں نہ کوئی مضائقہ ہے اور نہ ہی قابل اعتراض کوئی بات۔" (حوالہ سابق)

خواجہ صاحب غلط فہمیوں کے ازالے کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں حقائق غبار آلود ہو گئے ہوں، اگر یہ نکتہ ہندو عوام کے سیاق میں ہوتا تو بات معقول ہو سکتی تھی لیکن جو گروہ عقیدہ، اصول اور نسلی قومیت کی بنیاد پر اپنے احیا اور اپنے دشمن کی تباہی کے درپے ہو، جس کی جڑیں ہزار سالہ سیاسی، سماجی اور نفسیاتی تاریخ میں گہرائی کے ساتھ پیوست ہوں اس کی کس غلط فہمی کا آپ ازالہ کر سکتے ہیں۔ جہاں تک ہندتو کے عقائد اس کی قدیم روایات کے تحت ملک کے نظام کو چلانے اور حیات اجتماعی پر اس کی فکری بالادستی کا مسئلہ ہے تو یہ ممکن ہے آپ جیسے دانشوروں کے نزدیک اس میں کچھ مضائقہ نہ ہو اور ہندتو کو اس کا پورا حق حاصل ہونے کا سرٹیفکٹ عطا کر دیں لیکن جو لوگ علم و بصیرت رکھتے ہیں، اس ملک کا سماجی ترکیب، دستوری تاریخ، فکری و اعتقادی مسائل اور عملی تضادات سے واقف ہیں وہ ایسی سطحی رائے سے نہ اتفاق کر سکتے ہیں اور نہ اس قسم کی نامعقول تجویز پیش کرنے کی ہمت کر سکتے ہیں۔

فکری بالادستی کے حق میں ہندتو دفعہ ۳۷۰ کا خاتمہ چاہتا ہے، پرسنل لاز کو مٹا کر یونیفارم سول کوڈ کا نفاذ چاہتا ہے احساس ذلت سے نکل کر غلبہ و حکمرانی اور تہذیبی بالادستی کے اظہار کے لیے بابری مسجد کی بنیادوں پر ایک عظیم و قابل فخر مندر کی تعمیر چاہتا ہے۔ خواجہ صاحب اس میں کوئی مضائقہ ہے یا نہیں ہے؟ اعتراض کی کوئی بات ہو سکتی ہے یا نہیں؟ جہاں تک مسئلہ اقلیت و اکثریت کا ہے تو خواجہ صاحب علم اعداد کیا بتاتا ہے ہندتو کے علمبرداروں کی اس ملک میں تعداد کتنی ہے، آریوں کا فیصدی تناسب کیا ہے؟ کس جمہوری اصول کی بنیاد پر اپنے مفسدانہ اور تخریبی نظریات کو ملک پر تھوپنا چاہتے ہیں؟

خواجہ صاحب یہ ملک کسی کی جاگیر نہیں ہے۔ اس ملک میں کوئی ایک قوم نہیں بستی۔ اس ملک کی سب سے بڑی سماجی حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک کثیر القومی (Multy Racial) ملک ہے جس میں لاتعداد قومیں، نسلیں، قبائل اور ذاتیں آباد ہیں ان کی آزاد مرضی اور اتفاق کے بغیر کسی بھی نظریہ ء حیات کو تھوپنا فاشزم اور نازی ازم کا پرتو تو ہو سکتا ہے، شریفانہ اور معقول رویہ نہیں ہے۔

سکتا، یہی وجہ ہے کہ ملک کے اجتماعی ضمیر نے ہندتو کے فسطائی رجحانات کو مسترد کر دیا ہے۔

اس ملک میں شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائبس اور مسلمان سب سے بڑی اکثریتی یونٹ ہیں۔ شیڈول کاسٹ و ٹرائبس کی سب سے بڑی نمائندہ سماجی تحریک جو دلت مومنٹ کے نام سے معروف ہے وہ اپنے ہندو ہونے کو ہی سرے سے تسلیم نہیں کرتی اور الگ سے اپنی سماجی، سیاسی و دستوری شناخت کے لیے سرگرم جدو جہد کر رہی ہے، رہے مسلمان تو مٹھی بھر مفاد پرست سیاست دانوں اور بے ضمیر دانشوروں کے علاوہ پوری ملت اور اس کا غیر منظم اجتماعی شعور ہمیشہ سے اس فکر کا باغی و مزاحم رہا ہے۔ اس کے نامعقول اور وحشیانہ فلسفۂ حیات سے کوئی مسلمان تو کیا کوئی شریف غیر مسلم بھی ایک لمحہ کے لیے بھی اتفاق نہیں کر سکتا۔ لھذا ہندتو کا ایجنڈہ اکثریت کا ایجنڈہ نہیں ہے بلکہ خورد بینی اقلیت (Micro Minorty) کا ایجنڈہ ہے اس لیے اس کو اس بات کا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اپنے رجحانات اور فلسفہ کے مطابق کسی قسم کی کوئی تبدیلی پیدا کرے اور اہل ملک پر اس کو مسلط کرنے کا خواب دیکھے۔ ایسی ہر کوشش کی مزاحمت اور ایسے ہر خواب کو بے تعبیر کرنا عقل و انصاف کا تقاضا ہے۔ واضح رہے کہ مسلمان قرآن اور جدید سیاسی معیارات کے مطابق کوئی ناتواں اور بے بس اقلیت نہیں بلکہ ایک عظیم الشان ملت ہے جو خواجہ صاحب کے مطابق بھی تیس کروڑ سے کم نہیں ہے اور وہ ایسی ملت ہے جو ملکی و بین الاقوامی سطح پر نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ خواجہ صاحب کا شہکار ملاحظہ ہو فرماتے ہیں :

"میرا کہنا یہ ہے کہ اکثریت بالکل وہ سب کرے جو وہ چاہتی ہے مگر مسلمانانِ ہند کے ساتھ اس کا رویہ، رشتہ اور طرز عمل کیا ہو گا اس کی وضاحت کرے اگر ہماری تہذیب، تمدن، زبان، ثقافت، دینی و نسلی تشخص کو قائم رکھتے ہوئے ہندتو کے نظریہ کا نفاذ ہو تو ہمارے اعتراض کا کوئی جواز موجود نہیں، یہی وہ اسلوب وہ پیرایہ و پس منظر ہے جس میں اس بحث کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔" (حوالہ سابق)

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ اسلوب غلامانہ، وظیفہ خوارانہ اور یہ پیرایۂ بیان منافقانہ ہے، اس پس منظر سے ریشہ دوانی، دنیا پرستی اور ہوس ناکی کی بو آ رہی ہے۔ خواجہ صاحب کا کہنا اسلامی نقطہ نظر سے بے بنیاد اور بے سند ہے اور ملی نقطۂ نظر سے خود غرضانہ ہے، ہندتو کی نام نہاد اکثریت، جس کی حقیقت واضح کی جا چکی ہے وہ سب نہیں کر سکتی جو کرنا چاہتی ہے اور نادھرماشرما کا فلسفہ اب نہیں چل سکتا، اکیسویں صدی کا بھارت اس رجعت قہقری کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس ظلم و فساد کو روکنا

جو ہندتو کی صورت میں اس ملک پر مسلط ہوا چاہتا ہے مسلمانوں کا اجتماعی فریضہ ہے مسلمانون پر جس طرح ظلم سہنا حرام ہے اسی طرح ظالم کو ظلم کرتا ہوا چھوڑ دینا اور اپنے مفاد کی بنیاد پر اس سے مصالحت کر لینا بھی حرام ہے۔

ایسے قارئین کے لیے یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہو سکتی، خواجہ صاحب کو یہ امید کہ ہماری تہذیب، تمدن، زبان، ثقافت، دینی و نسلی تشخص کو قائم رکھتے ہوئے ہندتو کے نظریہ کا نفاذ ہو سکتا ہے، قارئین پچھلے صفحات میں ہندتو کے قائدین کے خیالات دفعہ ۳۷۰، بابری مسجد اور یونیفارم سول کوڈ کے تعلق سے بہ تفصیل پڑھ چکے ہیں اس کے ساتھ خواجہ کو امید ہے کہ وہ دینی و نسلی تشخص کے ساتھ ہندتو کا نفاذ کریں گے۔

خواجگی اپنوں کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

کاش خواجہ صاحب نے اپنے فکری افادات یہیں تک محدود رکھتے مگر افسوس ہے کہ متعدد مسائل میں اپنی اسی سطح بینی اور کم نگاہی کا بار بار مظاہرہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو اپنے رویہ میں تبدیلی کی دعوت دی ہے فرماتے ہیں ؛

"... مستقبل کا ہندستان اس فکری بحث کا تقاضا کرتا ہے۔ آج بھارتی جنتا پارٹی نے اپنی حلیف جماعتوں کے ساتھ مل کر جو قومی ایجنڈا تشکیل دیا ہے اس میں متنازعہ امور کو چھوڑ کر ہی نہیں بلکہ متنازعاتی روش کو ترک کر کے اتفاق رائے کی سیاست کی بات کی جا رہی ہے تو اس کا خیر مقدم ہونا چاہیے ----- قومی ایجنڈے کی تشکیل کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے، وہ جماعت کو ایک نظریاتی جماعت کہنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے، اپنے نظریہ کی عدم مقبولیت کو تسلیم کرتی ہے، عوام کے فیصلے کے آگے سر جھکاتی ہے، اپنی فکر و عمل کی تصحیح کرتی ہے، اپنے بنیادی نکات ہی نہیں بلکہ فکر سے بھی عوامی طور پر انحراف کرتی ہے، اتنا ہی نہیں اس کو لیکر صفائی بھی دیتی ہے، یقین بھی دلاتی ہے اور ضمانت بھی دیتی ہے پھر شک کا جواز کہاں بچا، یہ نکتہ غور طلب ہے۔" (حوالہ سابق)

یہ نقطہ یقیناً غور طلب ہے، خواجہ صاحب کی اس الیکشنی تقریر کی حقیقت اور ہندتو کی ہم نوائی کا راز سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک عام قاری کو اس سلسلے میں کوئی الجھن پیش نہیں آ سکتی کیوں کہ دستاویزی ریکارڈ ہم پیش کر چکے ہیں۔ جو نکتہ میرے نقطۂ نظر سے غور طلب ہے وہ مسلمانوں کی

المناک سادہ لوحی ہے۔ مسلمانوں نے اب تک چانکیاتی سیاست اور اس کے بطن نصاب کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی، حیرت انگیز طور پر صرف الفاظ کے مفہوم پر نظر رکھا اور بین السطور پر مدبرانہ نگاہ نہیں ڈالی جبکہ چانکیاتی سیاست میں لفظوں کے کبھی وہ عام اور معصومانہ مفہوم نہیں ہوتے جو عام طور پر لکھے اور بولے جاتے ہیں، چانکیاتی لغت کا علم نہ ہونے کی وجہ سے خواجہ صاحب کو لفظوں سے دھوکہ ہوا ہے جس کی بنا پر اپنی قوم سے شک واحتمال کے جواز پر باز پرس کر رہے ہیں۔ ہماری ملی تاریخ میں نارسائی و سادہ لوحی کا یہ ماتم انگیز تسلسل ہے جو مولانا آزاد سے خواجہ افتخار تک نہ جانے کتنے ہزار فرزندان ملت کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے اور یہ زوال فکر کا ایک بڑا نتیجہ ہے۔ ☆

بقیہ حواشی و مراجع (عالم اسلام پر فکری یلغار)

(۱۱) ملاحظہ ہو عبدالحمید احمد ابو سلیمان، اسلام اور بین الاقوامی تعلقات بس منظر صفحات ۲۲۱، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۶۰ اور ۲۸۱ وغیرہ، مصنف نے کئی مسائل میں جدیدیوں کے نقطۂ نظر کی وکالت کی ہے۔

(۱۲) ملاحظہ ہو محمد اسدؒ، اسلام ایٹ دی کراس روڈ، بطور خاص باب The speed of the west صفحہ ۴۲ تا ۶۲، نور پبلشنگ ہاؤس، فراش کانہ دہلی سنہ ۱۹۸ء

(۱۳) اسرار عالم، اسلام اور اکیسویں صدی کا چیلنج، صفحہ ۵۔

(۱۴) اسرار عالم عالم اسلام کی اخلاقی صورت حال صفحہ ۱۳۹ تا ۱۵۹، مصنف نے پوری صورت حال کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے، اور تاریخی نقد سے کام لیکر اپنے نتائج پیش کیے ہیں۔

جین مت

جین مت پر اسلام کے اثرات

اسلام نے جین مت پر کافی گہرے اثرات ڈالے ہیں [illegible] ہے۔ ۱۔ خصوصی اثرات ۔ ۲۔ عمومی اثرات

خصوصی اثرات

اس سے مراد وہ اثرات ہیں جو اسلام نے جین مت پر بلا شرکت غیرے ڈالے ہیں۔

عقیدہ توحید کی چھاپ

جین مت جو شرک اور اصنام پرستی کا موجد ہے، اسلام کے صاف و شفاف عقیدہ توحید سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ ہند میں اسلام کی سیاسی بالادستی کے دور میں جین مت میں متعدد اصلاحی تحریکیں نمودار ہوئیں جنھوں نے بت پرستی کی شدید مخالفت کی جیسے پندرہویں صدی کے اواخر میں تارن سوامی کی قائم کردہ تحریک "تارن پنتھی" جو تیر تھنکروں یا دوسرے جین بزرگوں کی مورتی پوجا کی سخت مخالف ہے۔ اسی طرح سویتامبر فرقے میں ۱۴۵۲ء میں لونکا ذیلی فرقہ اور پھر ۱۶۵۳ء میں اس کی اصلاح شدہ شکل استھانک واسی جماعت اور ۱۷۶۰ء میں قائم شدہ "تیرہ پنتھی" جماعت مورتی پوجا کی شدید مخالف ہیں۔

مذہبی کتابوں کی تقدیس کی خصوصی اہمیت کا تصور

اسلام سے پہلے جین مت میں مذہبی کتابوں کی تقدیس کا کوئی خاص تصور نہ تھا لیکن مذہب اسلام کے دینیاتی و عقائدی نظام میں مذہبی کتابوں کی تقدیس کے خصوصی تصور سے جین مت کافی متاثر ہوا اور اس نے بھی اپنے دینیاتی نظام میں مذہبی کتابوں کی تقدیس کی خصوصی اہمیت کا تصور پیش کیا اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہندوستان میں جینی مذہبی کتابوں کی اشاعت دیگر ہندوستانی مذاہب کے مقابلہ میں کافی زیادہ ہے۔

عمومی اثرات

اس سے مراد وہ اثرات ہیں جو اسلام نے پوری مشترک ہندوستانی تہذیب پر ڈالے ہیں اور جنھیں مختصر اً درج ذیل نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ اسلام نے ہندوستانیوں کے کھانے پینے اور رہنے سہنے اور دوسرے عام معاشرتی طریقوں میں ترقی دی۔

۲۔ ہندوستانی سماج و مذاہب میں بے ہودہ رسوم اور توہمات کا زور کم کیا۔

۳۔ فنِ عمارت کو خاص طور پر ترقی دی۔

۴۔ فنِ جنگ میں خاص ترقی ہوئی اور توپ اور بارود کو رواج دیا۔

۵۔ بعض علوم مثلاً علم النجوم، طبابت اور خاص کر تاریخ و جغرافیہ کا ذوق پیدا کیا۔

۶۔ نئے نئے پھل پھول لائے، باغبانی اور فلاحت کو بڑھایا اور عام ذوق میں اصلاح کی۔

جین مت اور اسلام میں وجوہ اتفاق و اختلاف

جین مت اور اسلام عقائد کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور الگ مذہب ہیں لیکن اس کے باوجود بھی دونوں مذاہب میں بعض تعلیمات مشترک ہیں جنھیں درج ذیل نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ دونوں مذاہب میں جھوٹ بولنا، چوری کرنا، زنا کرنا حرام ہے، چنانچہ جین مت کے پانچ بنیادی عہد میں ستیہ (راست گفتاری)، استیہ (چوری نہ کرنا)، اور برہمچریہ (پاکبازی) شامل ہیں۔ جبکہ قرآن مجید میں مذکورہ بالا تینوں جرائم کی شناعت و حرمت کا بیان جگہ جگہ موجود ہے۔

۲۔ دونوں مذاہب میں مذہبی کتابوں کی تقدیس مقاماتِ مقدسہ کی زیارت مسنون و مستحب ہے۔

۳۔ دونوں مذاہب میں طمع و لالچ کو تمام برائیوں کی جڑ قرار دیا گیا ہے اور کامیابی کے حصول کے لیے اس سے اجتناب کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے "حب الدنیا رأس کل خطیئة" دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ چنانچہ زکوۃ کی مشروعیت اور صدقات و خیرات کی ترغیب کا اصل مقصود نفس کو طمع و لالچ سے پاک کرنا ہے اور اہنسا جو جین مت کا بنیادی ستون ہے اور مرکزی اخلاقی تعلیم ہے اس سے مراد صرف جسمانی طور پر جانداروں کو تکلیف نہ پہنچانا ہی نہیں ہے بلکہ خیالات اور گفتگو میں تکبر، نفرت، تعصب، عدمِ احتیاط اور دنیاوی لالچ کا شکار ہونا بھی جین مت میں اہنسا کی خلاف ورزی سمجھی جاتی ہے۔

وجوہ اختلاف

۱۔ جین مت کا تعلق شرمن روایات سے ہے جس کی امتیازی خصوصیت خدا کے تصور سے بے نیاز ہونا ہے جبکہ اسلام کا تعلق سامی مذاہب سے ہے جس کی مرکزی و بنیادی تعلیم توحید ہے۔ چنانچہ جین مت نہ صرف شرک کا حامل ہے بلکہ اصنام پرستی کا موجد بھی ہے جبکہ اسلام کی اصل و اساس ہی توحید ہے اور قرآن کریم کی ایک تہائی آیات عقیدۂ توحید ہی کی تشریح و تعبیر سے متعلق ہیں۔

۲۔ جین مت عقیدہ کرم و آواگون کا قائل ہے جبکہ اسلام کے بنیادی عقائد میں عقیدۂ آخرت داخل ہے۔

۳۔ جین مت کی رو سے انسان کی دنیاوی زندگی غیر اطمینان بخش، دکھ اور خسارے کا سودا ہے جس سے چھٹکارا پانے کے لیے جین مت نفس کشی اور رہبانیت کی تعلیم دیتا ہے جبکہ اسلام اس دنیا کو آخرت کی ابدی زندگی کی کھیتی سے تعبیر کرتا ہے یعنی یہ دارالعمل اور دارالامتحان ہے اور آخرت دارالجزاء۔

۴۔ جین مت میں رہبانیت مرغوب و مستحسن ہے جبکہ اسلام میں رہبانیت کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔
(لا رهبانية فى الاسلام)

۵۔ جین مت میں مجسمہ سازی اور مورتی پوجا کو کافی اہمیت حاصل ہے، چنانچہ جنوبی ہندوستان میں جین ولیوں کے متعدد مجسمے نصب ہیں، شرون بیل گولا کے مقام پر جین ولی بھوبلی کا وہ عظیم الجثہ مجسمہ ہے جو ساڑھے چھپن فٹ اونچا ہے جبکہ اسلام میں مجسمہ سازی مطلقاً حرام ہے۔ ☆

فقہ و فتاویٰ

ادارہ

سوال: کسی حاملہ عورت کو اگر اس کے شوہر نے طلاق دے دیا ہو اور اسکی گود میں ڈھائی سال کا ایک بچہ ہو تو زچگی کا خرچ اور رضاعت کا معاوضہ کس پر اور کتنا واجب ہوگا نیز بچہ کی حضانت کا حق کیا اس کی ماں کو حاصل ہے؟ اور اگر حاصل ہے تو یہ حق کب تک رہے گا؟ اور بچہ کا نفقہ اس دوران کس پر اور کتنا واجب ہوگا؟

جواب: وضع حمل کے بعد عدت ختم ہو جانے کے بعد عورت رضاعت کے معاوضہ کا مطالبہ کر سکتی ہے اور باپ کے لیے اس کے مطالبہ کا تسلیم کرنا لازم ہے الا یہ کہ کوئی دوسری عورت ماں سے کم اجرت یا مفت میں دودھ پلانے پر راضی ہو۔ چنانچہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب "الدر المحتار" میں ہے: و هی احق بإرضاع ولدها بعد العدة إذا لم تطلب الزيادة على ما تأخذه الاجنبية دون اجر المثل بل الاجنبية المتبرعة احق بها۔ (۳٤۹/۵)

لہذا کوئی دوسری عورت ماں سے کم اجرت پر یا مفت میں دودھ پلانے پر راضی ہو تو باپ بچے کی ماں کے بجائے دودھ پلانے کے لیے بچے کو اس کے حوالے کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ عورت ماں کے گھر آکر بچے کو دودھ پلا جائے۔ چنانچہ علامہ ابن عابدین شامی کہتے ہیں کہ: "افاد أن الحضانة تبقى للام فترضعه الاجنبية المتبرعة بالإرضاع عند الأم. (۳٤۹/۵)

اگر ماں دودھ پلاتی ہے تو ایسی صورت میں باپ پر تین طرح کا خرچ عائد ہوتا ہے، رضاعت کا خرچ، پرورش کا خرچ، کپڑا، تیل، صابن وغیرہ کا خرچ۔ (دیکھیے ردالمحتار ۵/۳۴۹)

بچہ کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہے اور یہ حق بچے میں سات سال تک اور بچی میں اس کے بالغ ہونے تک ہے۔ (ردالمحتار ۵/۲۶۷) اس دوران بچے کے تمام اخراجات باپ کے ذمہ ہوں گے نیز ماں کو پرورش اور نگہداشت کی اجرت بھی دینی ہوگی۔

سوال: طلاق کی صورت میں عقد کے موقع پر عورت کو شوہر کی جانب سے دیے گئے

زیورات کی واپسی کا کیا شوہر کو حق حاصل ہے؟

جواب: شادی کے موقع پر طرفین کی طرف سے جو کچھ ایک دوسرے کو دیا جاتا ہے اس کی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ حدیث میں ہدیہ واپس لینے والے کی مثال اس کتے سے دی گئی ہے جو قے کرنے کے بعد اسے چاٹے، اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وإن اردتم استبدال زوج مكان زوج وآتيتم احداهن قنطاراً فلا تأخذوا منه شيئاً﴾ اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی کرنا ہی چاہو اور ان میں سے کسی کو تم نے خزانہ دے رکھا ہو تو بھی اس میں سے کچھ نہ لو (النساء/۲۰)

اس آیت کی روشنی میں لڑکی کو شادی کے موقع پر جو زیورات ملتے ہیں اس کی مالک وہ ہے شوہر کو ان زیورات کو واپس لینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ ☆

جامعۃ الصلاح نصیر پور، بندول، اعظم گڑھ

ایک مختصر تعارف

تاسیس سنہ ۱۹۹٦م اغراض و مقاصد

۱۔ اسلام کے جاوداں پیغام سے برادران وطن کو روشناس کرانا

۲۔ نئی اسلامی نسل کو تعلیم و تربیت کے ذریعہ دعوت و تبلیغ کے لیے تیار کرنا

۳۔ عصر حاضر میں عالم اسلام کے لیے مطلوبہ قیادت کو فراہم کرنا

۴۔ علماء و فقہا کے ساتھ جدید و عصری علوم کے متخصصین پیدا کرنا

۵۔ اسلام کی تہذیبی و ثقافتی میراث کا تحفظ

۶۔ ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے مدارس دینیہ کے درمیان ایسا رابطہ و تعلق پیدا کرنا جس سے غلبہ اسلام کی راہیں ہموار ہو سکیں۔

جامعہ کا تعلیمی نظام چار مراحل میں منقسم ہے

۱۔ ابتدائی مرحلہ (تحتانیہ) ۵ سال ۲۔ ثانوی مرحلہ (فوقانیہ) ۳ سال

۳۔ مجوزہ اعلیٰ مرحلہ فضیلت (عالیہ) ۷ سال یا مجوزہ شعبہ سائنس و ٹکنالوجی ۷ سال

آئینہ مدرسہ: تعداد مدرسین۔ ۲٦، تعداد ملازمین۔ ۴، تعداد طلبہ و طالبات۔ ٦۰۰، سالانہ خرچ۔ ۵ لاکھ روپئے اہل علم و اہل خیر حضرات سے گذارش ہے کہ اپنے مشوروں اور تعاون سے نوازیں۔

ناظم: جمیل احمد فلاحی

تعارف و تبصرہ

نام کتاب : "سفرِ حج، مغفرت کی منزل کا زینہ"

تصنیف : خلیل انجم۔ کامٹی

نوعیت : سفر نامہ

ملنے کا پتہ : خلیل انجم۔ ڈاکٹر شیخ بکر کالونی، کامٹی، ضلع ناگپور (مہاراشٹر) ۴۴۱۰۰۲

مبصر : سلیم انصاری، جبل پور، ایم پی

زیر تبصرہ کتابچہ خلیل انجم کے سفر حج کی روداد پر مشتمل ہے۔ کتابچہ ۳۲۰ صفحات پر محیط ہے۔ اس کتابچہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خلیل انجم نے اپنے سفر حج کی تفصیلات نہایت خلوص سے بیان کی ہیں۔ فریضہء حج ادا کرنے کی خواہش کے اظہار سے لیکر فریضہء حج ادا کر کے وطن واپس آنے تک کے تمام جذبات، واقعات اور مشاہدات کو خلیل انجم نے نہایت دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔

چونکہ خلیل انجم ایک قابل ذکر تخلیق کار ہیں، لہذا دوران سفر ان کے احساس دل نے قدم قدم ایک نئے تجربے کا احساس کیا اور انھیں نہایت موثر انداز میں تحریر کر دیا ہے۔

حج کے بارے میں ان کے جذبات کچھ اس طرح ہیں۔ "حج بیت اللہ اسلامی تعلیمات میں سب سے روشن اور ہمہ گیر عبادت کا نام ہے۔ فضیلت کے اعتبار سے حج ایک مکمل عبادت ہے جس میں نماز کے ساتھ ذکر و فکر بھی ہے، تسبیح و تحمید بھی ہے، طواف و سعی بھی ہے، خدا کی راہ میں قربانی بھی ہے، جسمانی مشقت کے ساتھ انفاق مال بھی ہے۔"

کسی بھی مسلمان کے لیے حج کی خواہش فطری ہے۔ حج کے ارکان خشوع و خضوع سے ادا

کرنے کا جذبہ بھی فطری ہے، دوران حج تطہیر قلب و ذہن کا عمل بھی فطری ہے لیکن دوران سفر درپیش مشکلات کا اظہار بھی بے مصرف نہیں کہ اس سے نئے عازمین سفر حج کو مسائل سے آگاہی ہوتی ہے۔ مثلاً عام طور سے حج کمیٹی اور حج ہاوس کے بارے میں لوگ غلط فہمیوں کا شکار رہتے ہیں مگر جب وہاں پہنچتے ہیں تو حقیقت کچھ اور ہی سامنے آتی ہے۔ خلیل انجم نے حج ہاوس اور اس کے عملہ سے اپنے Ineraction اور تجربات کو بھی اپنے کتابچہ میں تحریر کر دیا ہے۔ ان کے لفظوں میں "یہاں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہے۔ حج کمیٹی کے ایک قلی سے لیکر افسران تک رشوت خوری میں ملوث ہیں، آپ پچاس روپے دیجیئے روم پر بیٹھے بٹھائے آپ کا پاسپورٹ، ہوائی جہاز کے ٹکٹ اور دیگر ضروری کاغذات آپ کی دستخط کے بغیر آپ کو مل جائیں گے، حالانکہ یہ تمام کاغذات متعلقہ افسران کے ٹیبل پر تیار رہتے ہیں، آپ رپورٹ کیجیے اور حاصل کر لیجیے۔ میں نے کمیٹی کے ایک ذمہ دار آفسر سے جب شکایت کی تو ان کا جواب تھا "آپ پیسے کیوں دیتے ہیں؟"

یہ واقعہ جہاں ایک طرف مسلم اداروں کی بد حالی اور بد انتظامی کی نشاندہی کرتا ہے وہیں دوسری طرف دعوت فکر بھی دیتا ہے کہ ایسے اداروں کی بد انتظامی کو درست کرنے کی سمت پیش قدمی ہونی چاہیے۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ خلیل انجم نے اپنی روداد سفر حج کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے، لہذا سفر حج کی تفصیلات کے متعلق مزید معلومات کے لیے کتابچہ پڑھنا ضروری ہے۔ یہ کتابچہ خلیل انجم سے براہ راست حاصل کیا جا سکتا ہے۔

کتابچہ کے اخیر میں کلیل انجم نے اپنی ایک نعت بھی شائع کی ہے جس سے ان کے جذبہ عقیدت کا احساس ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ سے ان کے والہانہ عشق اور مدینہ دیکھنے کی زبردست دلی خواہش کے طفیل انھیں مدینہ کی زیارت اور سفر حج کی زیارت نصیب ہوئی۔

رات ایک دیوانہ کہہ رہا تھا مستی میں
میری آنکھ کعبہ ہے میرا دل مدینہ ہے

خلیل انجم کے اس شعر سے ان کے عشق نبی کی سرشاری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مجموعی اعتبار سے ان کا سفر نامہ دلچسپ ہے۔

ترانۂ فلاح

شبیر احمد انور اصلاحی مفتاحی
خادم قدیم جامعۃ الفلاح

مطلع انوار رحمت ہے فلاح
مصدر عرفان و حکمت ہے فلاح

شہ ولی اللہؒ کے اسرار سربستہ منزل قاسمؒ و مودودیؒ کا ہم رشتہ
فکر شبلیؒ و فراہیؒ کا ہے گلدستہ آئینہ افکار ملت ہے فلاح

مطلع انوار رحمت ہے فلاح
مصدر عرفان و حکمت ہے فلاح

سر زمین ہند کی قسمت جگی بجھ گئی ہے ساری اس کی تشنگی
اسکی ساری چھٹ گئی ہے تیرگی نور حق شمع ہدایت ہے فلاح

مطلع انوار رحمت ہے فلاح
مصدر عرفان و حکمت ہے فلاح

گونج کر اسکے مؤذن کی صدا ہے فضا میں بن گئی بانگ درا
جادہ پیما ہوگیا ہے قافلہ ہاں اسی میں بہر ملت ہے فلا

مطلع انوار رحمت ہے فلاح
مصدر عرفان و حکمت ہے فلاح

آگہی ہے اب دلوں کی آرزو اس کے ہر چپے میں ہے الفت کی خو
علم و حکمت ہی ہے سب کی جستجو اہل دانش کی یہ جنت ہے فلاح

مطلع انوار رحمت ہے فلاح
مصدر عرفان و حکمت ہے فلاح

بچیاں زہرہ بنیں بچے حسینؓ کیوں کہ ان کی تربیت ہے فرض عین
اب ملے گا ملت خستہ کو چین تربیت گاہ نبوت ہے فلاح

مطلع انوار رحمت ہے فلاح
مصدر عرفان و حکمت ہے فلاح

بن گئے طلبہ ادھر عالی صفات بہرہ ور ہیں علم و فن سے طالبات
پاگیا ہے ہر کوئی راہ نجات اہل صفہ کی امانت ہے فلاح

مطلع انوار رحمت ہے فلاح
مصدر عرفان و حکمت ہے فلاح

مادر علمی ہے تو، ہم نونہال ہے تری شان جلالی میں جمال
علم و فن میں ہم نے پایا جو کمال سب ترا مرہون منت ہے فلاح

مطلع انوار رحمت ہے فلاح
مصدر عرفان و حکمت ہے فلاح

خیر امت کی یہی تفسیر ہے اور 'اقیموا الدین' کی تعبیر ہے
قصر ملت کی نئی تعمیر ہے مقصد ابرار ملت ہے فلاح

مطلع انوار رحمت ہے فلاح
مصدر عرفان و حکمت ہے فلاح

ہر طرح عصمت بچائیں گے تری شان سے شوکت بڑھائیں گے تری
ہم نہیں صورت بھلائیں گے تری انورؔ آبروئے ملت ہے فلاح

مطلع انوار رحمت ہے فلاح
مصدر عرفان و حکمت ہے فلاح

☆

روداد انجمن

مولانا نور محمد فلاحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر تعزیتی نشست

محمد اکرم فلاحی
سکریٹری انجمن طلبہ ء قدیم قطر یونٹ

مادر علمی جامعۃ الفلاح کے مخلص استاذ مولانا نور محمد فلاحی صاحبؒ کی وفات کی اندوہناک خبر قطر میں فلاحی برادران ودیگر وابستگان میں بڑے رنج وغم کے ساتھ سنی گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس مناسبت سے ۲۰؍ فروری ۲۰۰۰ء کو بعد نماز مغرب فلاحی برادران کی ایک تعزیتی نشست محترم مولانا قاری محمد عرفان شمسی فلاحی ازہری صاحب کے زیر صدارت منعقد ہوئی، نشست کا آغاز برادرم فیاض احمد فلاحی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا، انھوں نے سورہ بقرہ کی استعانت بالصلوہ والصبر اور ترجیع والی آیات تلاوت کیں۔ بعد ازاں انھوں نے اپنے تعزیتی کلمات اور تاثرات مولانا مرحوم کے سلسلے میں عرض کیے اور مولانا کے اخلاقی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مولانا مرحوم کی زندگی حسن اخلاق کا بہترین نمونہ تھی، سب سے معروف صفت ان کی خوش مزاجی تھی جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا "تبسمك في وجه اخيك صدقة"۔ حدیث۔ ایک دوسری جگہ آپ ﷺ نے فرمایا " أن تلقى اخاك بوجه طليق "، حدیث۔ مولانا مرحوم اس کے مصداق تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ ہر خاص وعام میں یکساں مقبول اور ہر دلعزیز تھے دوسری صفت مولانا کی یہ تھی کہ ان کے اندر حلم وبردباری کا عنصر بہت زیادہ تھا، آپ کو اپنے فرائض کی ادائگی کا پورا احساس رہتا تھا، آپ طلبہ کے نگراں رہے دوران نگرانی طلبہ کی تربیت و تعلیم کی پوری فکر کرتے اور موقع بموقع ان کی تذکیر اور رہنمائی کرتے رہتے تھے ٹھیک اسی طرح سے فریضہ تدریس کی ادئگی میں کافی محنت کرتے ہمیشہ مطالعہ کر کے درس دیتے اور دوران درس طلبہ کو مفید نصائح و مشوروں سے نوازتے رہتے اکثر وبیشتر آپ طلبہ کی مشکلات اور پریشانیوں میں دلچسپی لیتے اور ان کا مناسب حل ڈھونڈتے۔ ان کی ایک نمایاں صفت ان کا اخلاص تھا وہ

جامعۃ الفلاح کے کاموں میں بہت مخلص تھے اس کے لیے رات ودن محنت کرتے اور جامعہ کی خدمت کرتے ہوئے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ حیات نو کے مدیر مسئول کی حیثیت سے آخر دم تک اپنی خدمات انجام دیتے رہے ساتھ میں انجمن طلبہ ء قدیم کے سکریٹری کی حیثیت سے بھی آپ نے انجمن کے لیے نمایاں کام انجام دیے۔

برادرم ابو نافع فلاحی نے اپنے احساسات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آپ منکسر المزاج تھے اور سادگی آپ کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری تھی، انھوں نے کہا کہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی جانب سے پہلا تدریبی دورہ جو جامعہ سلفیہ بنارس میں منعقد ہوا اس میں مولانا مرحوم کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا ان کی سادگی اور ملنساری کے ساتھ میں نے ان کو درسیات میں ذہین پایا دورۂ تدریب کے نتائج میں وہ دوسرے نمبر پر ممتاز تھے۔

برادر مکرم مولانا عبد الحلیم صاحب فلاحی نے اپنے تعزیتی تاثرات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ دنیا سے ہر ایک کو جانا ہے مولانا ایک لمبی علالت کے بعد ہم لوگوں سے جدا ہوئے جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ بیماری بھی مومن کے گناہوں کا کفارہ ہے ہم اللہ تعالی سے دعاگو ہیں کہ اللہ تعالی ان کی طویل علالت کو ان کی مغفرت کا ذریعہ بنادے۔ مولانا مرحوم فراغت کے بعد تدریس کی غرض سے چھندواڑہ مدھیہ پردیش چلے گئے تھے لیکن جب جامعۃ الفلاح کو آپ کی ضرورت محسوس ہوئی تو ۱۹۷۷ء میں آپ جامعۃ الفلاح واپس آگئے۔ آپ نے تدریس کا آغاز ابتدائی درجات سے کیا اور بعد میں اپنی صلاحیت اور محنت کی وجہ سے عربی درجات کے اہم مضامین کی تدریس کی ذمہ داری آپ کو تفویض کردی گئی تھی۔

آپ امین اور دیانت دار تھے اور اس بنا پر طلبہ اور ان کے سرپرست بھی آپ پر اعتماد کرتے تھے، بہت سے طلبہ کی امانتیں آپ کے پاس ہوا کرتی تھیں۔ آپ کے اندر تواضع، خوش مزاجی اور صبر وشکر کا مادہ بدرجہ ءاتم موجود تھا۔ مشکل ترین حالات میں بھی آپ چہرے کی خوش مزاجی پر کوئی فرق نہ آتا تھا۔

آپ نے فرمایا کہ مولانا مرحوم کی اس موت سے ہم کو نصیحت حاصل کرنی چاہیے اور ہم سب کو اس کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے اور اپنے حالات میں سدھار لانا چاہیے اور زیادہ سے زیادہ اعمال

صالحہ کرنے چاہئیں اور ایک دوسرے کے متعلق دلوں کو صاف رکھنا چاہیے۔

بعد ازاں برادرم موسی کلیم فلاحی نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور مولانا مرحوم کے اوصاف حمیدہ کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ مولانا تمام ہی طلبہ میں یکساں مقبول تھے اور طلبہ کی تربیت بہت ہی شفقت و محبت سے کرتے تھے۔ آپ طلبہ کی مدد کرتے تھے خواہ آپ کے حالات کتنے ہی سخت ہوں لیکن جب کوئی اپنی ضرورت لیکر پہنچ جاتا تو اسے آپ خالی نہ لوٹاتے اور بعد میں کسی قسم کا کوئی تقاضانہ کرتے۔

آخر میں برادر محترم مولانا قاری محمد عرفان شمسی صاحب نے اپنے تعزیتی کلمات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ مولانا مرحوم ایک فاضل عالم اور خوددار انسان تھے اور ان کا اخلاص ہر جگہ نمایاں تھا، جامعہ کے کاموں میں بالخصوص اگر فریضہ تدریس انجام دے رہے ہوں تو ان کو ایک کامیاب استاذ کی حیثیت سے دیکھا جاسکتا ہے اور جامعہ کی ضروریات کے پیش نظر مولانا مرحوم جب جامعہ سے باہر کا سفر کرتے تو جامعہ کے ایک مخلص سفیر کی حیثیت سے دیکھا جاسکتا ہے۔ اور جب وہ وفد کے ساتھ امارات، قطر، کویت، سعودیہ عربیہ، ملیشیا وغیرہ ممالک کا سفر کرتے تو رات دن اپنے آپ کو مادر علمی کے فنڈ کی فراہمی کے لیے ہمہ تن مصروف رکھتے اور اس کے لیے فکر مند رہتے۔ غرضیکہ وہ جامعہ کے ایک قابل افتخار فرزند تھے۔

اس طرح آپ نے انجمن طلبہ قدیم کی مختلف ذمہ داریوں کو حسن و خوبی انجام دیا، آپ کبھی سکریٹری کی حیثیت سے تو کبھی مدیر مسئول حیات نو کی حیثیت سے پورے اخلاص کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو نبھایا۔ مولانا مرحوم کی فراغت کے وقت الوداعی پارٹی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ مولانا محترم شہباز احمد اصلاحی ہندی حفظہ اللہ مرحوم کے بچے سے کافی محبت و شفقت کرتے تھے۔ اس موقع پر آپ نے چند اشعار کہے تھے جن میں سے چند یہ ہیں۔

دونوں شبیر و صابر، مشرف — ہر دو عالم میں پھولو پھلو تم
نور، عبدالمجید اور خالد — خوش رہو تم جہاں بھی رہو تم

اس کے بعد آپ نے مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی کہ اللہ تعالی ان کی مغفرت فرمائے، ان کی قبر کو کشادہ فرمادے، اس کو نور سے بھر دے۔ ان کے درجات کو بلند فرمائے، ان کو جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے۔ ان کے اہل و عیال اور تمام اعزہ واقارب اور جملہ وابستگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

تعزیتی نشست اپنے اختتام پر تھی کہ اچانک برادرم رضوان الحق فلاحی کے والد کے انتقال پر ملال کی خبر بذریعہ ٹیلیفون موصول ہوئی اس پر سب لوگوں نے رنج و غم کا اظہار کیا اور پھر برادرم فیاض احمد فلاحی نے مولانا مرحوم، رضوان الحق فلاحی صاحب کے والد مرحوم اور اپنے چچا مرحوم جن کا انتقال چند دنوں قبل ہوا تھا، سب کی نماز غائبانہ پڑھائی۔

جامعہ ملیہ میں فلاحی طلبہ کی تعزیتی نشست

ٹوٹ کر سورج گرا کرنیں پریشاں ہوگئیں
دفن اک لمحے میں جانیں کتنی صدیاں ہوگئیں

محترمی و مکرمی!

السلام وعلیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حاب خیر تظیر۔ اپنے ایک قریبی ساتھی سالم اعظمی کے ذریعہ مولانا نور محمد صاحب فلاحی مرحوم کے انتقال پر ملال کی خبر سن کر ہم لوگوں کو جو قلبی افسوس ہوا، اس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا مرحوم سے ہمارے دیرینہ تعلقات تھے۔ جامعۃ الفلاح میں دوران تعلیم مولانا مرحوم نے ہمارے ساتھ جس تعاون و ہمدردی کا مظاہرہ کیا اس کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

اس جانکاہ خبر کو سن کر ہم تمام ساتھیوں نے جو فلاح سے منسلک رہے ہیں، ابوالفضل انکلیو اوکھلا میں ایک تعزیتی پروگرام کا انعقاد کیا۔ اور مولانا مرحوم کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ اس تعزیتی پروگرام کا لب لباب یہ تھا۔

مولانا ایک عظیم شخصیت کے حامل تھے جن کی پوری زندگی اسلامی تعلیمات کا چلتا پھرتا نمونہ تھی۔ مادر علمی جامعۃ الفلاح سے منسلک ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ طلبہ کے ساتھ ان کا گہرا لگاؤ تھا اور ان کی اصلاح و تربیت میں مولانا کا اہم کردار ادا کرنا، تعلیمی و تربیتی اور تحریکی میدان میں ان کی رہنمائی کرنا آپ کی زندگی کا خاص عنصر تھا۔ اخیر میں مولانا مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی گئی کہ اللہ تعالی ان کے درجات کو بلند کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

جامعہ کے لیل ونہار

ادارہ

جامعہ میں کمپیوٹر سنٹر کا قیام

طلبہ کو جدید وسائل تعلیم سے آگاہ کرانے کے لیے جامعۃ میں یکم مئی ۲۰۰۰م کو کمپیوٹر ٹریننگ سنٹر کا قیام عمل میں آیا۔ جس کی افتتاحی تقریب کا آغاز کرتے ہوئے ناظم جامعۃ الفلاح جناب مولانا ابوالبقاء صاحب ندوی نے فرمایا: کمپیوٹر کی تعلیم آج ہر ایک کی ضرورت بن گئی ہے، طلبہ و اساتذہ بھی اس سے مستثنی نہیں کیوں کی علوم وفنون کا وافر ذخیرہ کمپیوٹر وانٹرنیٹ میں سمو دیا گیا ہے جسے بسہولت دوسرے ذرائع سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ دشمنان اسلام کی تحریفات وسازشوں کا جواب دینے اور فریضہ دعوت حق کو حسن وخوبی انجام دینے کے لیے بھی اس سے واقفیت ضروری ہے۔

طلبہ کی ہمدردی اور جامعہ کی ہمہ جہتی ترقی کے لیے شدید تڑپ کا اظہار کرتے ہوئے مولانا نے مزید فرمایا کہ جامعہ نے شروع ہی سے دینی ودنیوی علوم کو باہم مربوط کرنے کی کوشش کی اور اس کے خاطر خواہ اطمینان بخش نتائج سامنے آئے اس لیے اب فنی اور تکنیکی تعلیم کا انتظام بھی اس کے مقاصد کا ایک اہم شعبہ بن چکا ہے۔

جناب کامل رضا صاحب استاذ شعبہ ثانوی نے کمپیوٹر کی ماہیت اور اس کے فوائد ونقصانات پر مختصراً روشنی ڈالی۔ استاد کمپیوٹر سیکشن جناب رئیس احمد صاحب فلاحی نے بتایا کہ وسائل وذرائع بذات خود نافع وضار نہیں ہوتے اصل انحصار استعمال کرنے والوں کے اوپر ہوتا ہے۔ یہ آج دشمنان اسلام کے قبضہ میں ہے اس لیے ہمارے خلاف استعمال ہو رہا ہے اگر ہم اس پر قابض ہو جائیں تو پھر وہ ہمارے لیے نفع بخش ہو جائے گا۔ استاد تفسیر مولانا نعیم الدین صاحب اصلاحی نے کہا کہ آج کے دور میں کمپیوٹر کے میدان میں سبقت کے بغیر ترقی ممکن نہیں۔ ہمارے ملک نے اس میدان میں کافی ترقی کی ہے اس لیے اس کا مقام تسلیم کیا جانے لگا ہے۔ ہم بھی آگے بڑھیں، ہماری بھی قوت تسلیم کی جائے گی۔

تعزیتی نشست

استاد محترم جناب مولانا نور محمد صاحب کے انتقال کے موقع پر جامعہ کی جانب سے ابواللیث ہال میں ۷ار فروری ۲۰۰۰م کو ایک تعزیتی نشست منعقد ہوئی۔ صدر جامعہ مولانا طاہر صاحب مدنی نے فرمایا کہ: حلقہ جامعہ میں مولانا کی مقبولیت کا سبب جامعہ کے لیے آپ کا اخلاص تھا۔ جامعہ کے کام کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ موصوف سادگی پسند اور بڑے ہی ملنسار تھے۔

مولانا کے دیرینہ رفیق جناب مولانا مطیع اللہ صاحب مدنی نے اپنے تعزیتی کلمات میں فرمایا: مولانا نیک دل اور انتہائی شریف النفس تھے 'المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ' کے مکمل مصداق تھے۔ اگر کسی کے بارے میں محسوس کرتے کہ وہ ناراض ہے تو اس طرح ملتے کہ وہ رنجش بھول جاتا اور گرویدہ ہو جاتا۔ مولانا کی ایک اہم خوبی صبر تھی چنانچہ طویل علالت کے دوران بھی اپنے زائرین اور عیادت کرنے والوں سے اس طرح ہنستے ہوئے ملتے گویا وہ صحتیاب ہوں۔ موصوف قوت ایمانی سے لبریز تھے اور باز پرس سے ہمیشہ خائف رہتے تھے چنانچہ ایک نازک موقع پر جبکہ فیصلہ غلط محسوس ہوا تو روتے ہوئے کمرے میں گئے اور دیر تک روتے رہے۔

جناب مولانا کمال الدین صاحب استاد شعبہ ابتدائی نے فرمایا: مولانا میرے استاد رہے ہیں ان کا انداز بیان دلنشین اور اسلوب انتہائی سادہ تھا۔ اپنے مضمون کی بھرپور تیاری کر کے آتے اور پوری گھنٹی انتہائی مستعدی کے ساتھ پڑھاتے۔ طلبہ کے ساتھ آپ کا برتاؤ مشفقانہ ومخلصانہ تھا۔ ہر طالب علم یہ سمجھتا کہ مولانا مجھے سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔ جامعہ سے مولانا کو دلی لگاؤ تھا اس کی تعمیر ترقی کے لیے اندرون ملک برابر سفر پر جاتے رہے۔ آخری عمر میں فالج کا اثر مدرسہ کیلیے بمبئی کے ایک سفر کے دوران ہی ظاہر ہوا تھا۔

صدر انجمن جناب مولانا رحمۃ اللہ اثری صاحب فلاحی نے اپنے گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے مولانا کے ساتھ سفر وحضر میں اپنی قدیم رفاقت کا ذکر کیا۔ اور ہر موڑ پر آپ کے پر خلوص تعاون کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر میں یہ کہوں کہ میرا دست راست مجھ سے کٹ گیا تو یہ مبالغہ کی بات نہ ہوگی۔ مولانا کا یہ تعاون مجھے جامعہ، طلبہ اور انجمن سبھی کے مسائل کے حل میں حاصل رہا۔ آخر میں یہ تعزیتی نشست دعا پر اختتام پذیر ہوئی۔

فلاحی برادران کو صدمہ

یہ خبر جملہ فلاحی برادران کے لیے باعث رنج و غم ہوگی کہ جناب مولانا بدر عالم صاحب فلاحی (۱۹۷۲ء) کے والد محترم جناب جان محمد بن اسماعیل صاحب جو کافی دنوں سے علیل تھے ۲۵ر جنوری کی شب میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ۲۶ر جنوری کو بعد نماز ظہر آپ کی تجہیز و تکفین عمل میں آئی۔ مرحوم ایک دیندار اور متقی شخص تھے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر ہمیشہ نگاہ رکھتے۔ آپ جامعہ کے پڑوسی تھے اور جامعہ سے آپ کو گہرا اور قلبی لگاؤ تھا۔

اسی طرح یہ خبر بھی ہمارے لیے سوہان قلب و روح ہوگی کہ محترم جناب عبدالحق صاحب فلاحی کی والدہ محترمہ ۲۰ر جنوری ۲۰۰۰ء کو بروز جمعرات بعد نماز ظہر انتقال کر گئیں۔ ۲۱ر جنوری کو بعد نماز جمعہ آپ کی تجہیز و تکفین عمل میں آئی۔ موصوفہ صوم و صلوٰۃ کی پابند اور اذکار و اوراد کی خوگر تھیں۔ اپنے بچوں اور بچیوں کی تعلیم و تربیت پر ہمیشہ نگاہ رکھتیں۔

اسی طرح ایک اور حادثہ جو ہمارے لیے بڑا دردناک اور افسوسناک ہے کہ سہیل احسن صاحب فلاحی کے والد محترم ۳۱ر جنوری کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ موصوف کافی انصاف پسند اور سماجی آدمی تھے۔ گاؤں کی ہمہ جہتی ترقی اور مظلوموں کو انصاف دلانے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ مذکورہ بالا جملہ مرحومین کی مغفرت فرمائے اور انھیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔

حیات نو کا

مولانا صدرالدین اصلاحی نمبر

منظر عام پر

الحمد للہ مولانا صدرالدین اصلاحی نمبر منظر عام پر آچکا ہے۔ یہ نمبر سوانحی خاکہ ہی نہیں دعوتی جدوجہد کے مراحل نشیب و فراز میں تحریکی حوصلہ و امنگ کی جگمگاتی ہوئی تاریخی دستاویز بھی ہے۔ تقسیم ہند کے مابعد مایوس کن حالات میں عقیدہ و ایمان کی حفاظت و اشاعت کی جرأتمندانہ منصوبہ بندی کی وہ روداد ہے جس نے مسلمانوں کو دین کی محبت کے ساتھ جینے کا حوصلہ اور دین کی سربلندی میں اپنی سرفرازی کا شعور و احساس عطا کیا۔ غرض یہ نمبر مولانا کی فنافی الجماعت شخصیت و زندگی کا ایک ایسا حسین مرقع ہے جس کے مطالعہ سے ایک نئی قوت ایمانی ملے گی۔ ایجنٹ و قارئین حضرات جلد از جلد اپنا آرڈر بک کرالیں۔

درس عبرت

عبدالرؤف صابر رحیمی

آدمی جو کچھ یہاں کرتا ہے لکھا جائے گا
دولت اعمال کو محشر میں تولا جائے گا
خالق کونین کی طاعت پہ جو قرباں نہیں
آتش دوزخ میں وہ انسان ڈالا جائے گا
دور جو انسان تقوی کی بہاروں سے ہوا
جنت الفردوس سے وہ دور رکھا جائے گا
یاد میں اسکی فنا کرلے تو اپنے آپ کو
جس سے وہ ناراض ہوگا وہ نہ بخشا جائے گا
بچ نہیں سکتا ہے وہ تہ خانہ فولاد سے
موت کی زنجیر میں جس وقت جکڑا جائے گا
فرش مخمل پر بدلتے ہیں جو کروٹ رات دن
سر کے نیچے قبر میں پتھر نہ رکھا جائے گا
دولت حسن عمل سے جس کو کچھ رغبت نہیں
چھوڑ کر دنیا کو صابرؔ ہاتھ ملتا جائے گا

☆

مولانا مودودیؒ کے آبائی مکان کو "مولانا مودودی ہاؤس" بنانے کا فیصلہ

دہلی ۳۰ر جون مولانا مودودی میموریل فاؤنڈیشن (رجسٹرڈ [illegible]) نے فیصلہ کیا ہے کہ اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں واقع مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ کی جائے پیدائش اور ان کے آبائی مکان میں "مولانا مودودی ہاؤس" قائم کیا جائے گا۔ مولانا علیہ الرحمہ کی تاریخی یادگار کو فاؤنڈیشن نے حال ہی میں حاصل کیا ہے۔ واضح رہے کہ "مولانا مودودی میموریل فاؤنڈیشن" کو ٹرسٹ کی حیثیت سے یہاں حال ہی میں رجسٹرڈ کرایا گیا ہے اور جناب انتظار نعیم، جناب محمد جاوید اقبال، جناب کوثر یزدانی، جناب فاروق خاں، جناب محمد اشفاق احمد، جناب مجتبی فاروق، جناب محمد احمد اور جناب نسیم غازی ٹرسٹ کے ذمہ داران ہیں۔

حلقۂ یاراں

سید عبدالرحیم فلاحی

بھساول

جناب محترم مولوی عبدالبر اثری فلاحی صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ کرے آپ بخیر ہوں۔ حیات نو پابندی سے موصول ہو رہا ہے۔ ماہ اکتوبر کے تمام مشمولات قابل قدر ہیں۔ ابو صادقہ کوثر فلاحی صاحب کا مضمون پڑھکر علم میں اضافہ ہوا۔

جناب محمد عارف عمری صاحب کی تاثراتی تحریر پڑھکر مجھے وہ زمانہ یاد آگیا جب میں جامعۃ الفلاح میں زیر تعلیم تھا۔ مولانا داؤد اکبر اصلاحی صاحب مرحوم سے ہم نے عالمیت چہارم میں قرآن مجید پڑھا تھا۔ مولانا مغفور فکر فراہی کے ترجمان اور نقیب تھے۔

فاضل مضمون نگار نے مولانا مرحوم کے طالب علمی کے زمانہ کے متعلق رفع یدین نہ کرنے کا ذکر کیا جبکہ جامعہ میں ہم نے انھیں رفع یدین کرتے دیکھا تھا۔

۱۵ر اگست کے موقع پر جامعہ کی مسجد میں طلبہ کا پروگرام تھا ان دنوں مولانا مرحوم علیل چل رہے تھے اور نماز اپنے حجرے ہی میں ادا کر رہے تھے کچھ افاقہ ہوا تو مسجد میں نماز باجماعت ادا کی۔ اس دن ہم نے پوچھا تھا کہ مولانا محترم آپ جلسہ میں تشریف نہیں لائے؟ تو پہلے خاموش رہے پھر ہمارے اصرار پر صرف اتنا بتایا کہ بیماری کی حالت میں مسجد میں حاضری نہیں دی اور جب اچھا ہوا تو جلسہ میں کس طرح شرکت کرتا مجھے شرم آئی کہ جلسہ میں تو شرکت کروں اور نماز کے وقت غیر حاضر رہوں۔ اس سے مولانا مرحوم کے مسجد سے تعلق کا اندازہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو غریق رحمت کرے آمین۔

☆